حصہ سوم

علماء ہند کی شاندار ماضی

الشہیدین السعیدین

یعنی

سیرت حضرت سید احمد صاحب شہید
وسیرت حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب شہید
و دیگر مجاہدین ہند قدس اللہ اسرارہم

از
محمد میاں ناظم جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ

مجاہد جلیل۔ غازی ملت حضرت علامہ محمد بن عبداللہ انصاری عرف مولانا منصور انصاری مدظلہ العالی
مقیم کابل کی یہ مبارک تصنیف اپنے موضوع پر سب سے پہلی تصنیف ہے۔

(جس میں)

علم عقائد کو سیاسی اصول پر ترتیب دیا گیا ہے۔ نماز کا روحانی فلسفہ۔ سورہ فاتحہ کی سیاسی تفسیر۔ سیاست روحانیت اور اجتماعیت کا باہمی رابطہ۔ حکومت الٰہی کی بارگاہ میں حلف وفاداری امن و سلامتی کی معجزانہ تعلیم تربیت اور عملی مشق۔ روحانی اور اخروی فلاح کیلئے کیمیا اثر بےنظیر تلقین و تفہیم پاکباز دریعے مومن کے فرائض منصبی اور روح پرور بصیرت افروز سعادت آموز فلاح بخش بلند پایہ مستند اور صحیح مضامین کا عجیب و غریب مجموعہ ہے۔ طرز تحریر دلچسپ دلدوز۔ طرز استدلال نہایت قوی۔ شکوک و شبہات سے پاک۔ حقیقت یہ ہے علامہ موصوف نے دنیا اسلام بلکہ تمام دنیا پر ایک احسان عظیم کیا ہے علماء۔ صوفیاء۔ لیڈر اور قومی۔ وطنی خدمت کے دلدادہ آئیں اور دیکھیں کہ سلامتی اور امن عالم کے بالکل صحیح اصول یہ ہیں۔

کتابت۔ طباعت سائز دلپسند صفحات ۱۹۲ قیمت صرف ۸ر قسم اول ۱۰ار

ملنے کا پتہ کتب خانہ فخریہ امروہیہ گیٹ۔ مرادآباد

حصۂ سوم

وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ

الشہیدین السعیدین

یعنی

سیدنا سیّد احمد صاحب شہید

و

مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب شہید

قدس اللہ سرہما

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

خاندان ولی اللہ کا تیسرا طبقہ

سیدنا حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ

سیدنا حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ

سیدنا حضرت مولانا شاہ یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

سیدنا حضرت شاہ عبد الحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

(حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا شاہ عبد الغنی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے فرزند ارجمند تھے۔ یعنی سیدنا الطائفہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہ کے پوتے۔) جیسا کہ پہلے گزرا۔ یہ سب حضرات خاندان ولی اللہی سے قرابت رکھتے تھے لیکن ایک مقدس بزرگ اور ہیں۔ مومنین قانتین کے امام۔ مجاہدین ملت کے مایہ ناز امیر۔ رہروان طریقت کے رہنمائے اعظم یعنی
سیدنا ومولانا حضرت سید احمد صاحب بریلوی قدس اللہ سرہ العزیز
حضرت سید صاحب نسباً حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے خاندان سے مربوط نہ تھے۔

لیکن روحانی تعلق نے عزیز، قریب سے زیادہ آپ کو اس مقدس خاندان سے مربوط کردیا تھا۔ آپ سیدنا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے خلیفۂ اعظم تھے اور معارف باطنیہ اور ملکات روحانیہ میں اپنے تمام معاصرین پر فائق۔

اس طبقہ کی ابتداء میں سیاسی ماحول وہی تھا جو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے آخری دور میں بیان کیا گیا۔ یعنی انگریزی حکومت دہلی سے آسام تک قوت کے ساتھ مسلط ہو چکی تھی۔ مدراس میسور۔ دکن۔ بمبئی۔ گجرات سی۔پی وغیرہ کے تمام علاقے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر نگیں ہو گئے تھے۔

سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ باقی تھا۔ جو اصرف زندہ یا بیں ہمایشہ کے لئے گل ہونیوالا تھا۔ معمولی نواب سے زیادہ شاہ دہلی کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اور یہ ریاست بھی دہلی شہر اور قلعہ تک محدود ہو گئی تھی

دریا ستلج کے پرلے کنارے سے ہندوستان کی شمال مغربی سرحد تک سکھوں کا غلبہ تھا۔ رنجیت سنگھ کی حکومت اگرچہ انگریزوں سے توسعا میں کم تھی۔ مگر تاہم مستحکم تھی —— کابل اپنی خانہ جنگی میں مصروف تھا جس کے باعث انگریزوں کے قدم ایران کی سرحد تک پہنچ چکے تھے۔

مختصر یہ کہ آسام سے لیکر ایران کی حدود تک مسلمان دو زبردست طاقتوں میں گھرے ہوئے تھے (۱) انگریز (۲) سکھ۔

رنجیت سنگھ از ۱۸۰۸ء تا ۱۸۳۹ء گورنمنٹ برطانیہ کا معاہد رہا۔

سب سے پہلے علمبردارانِ حریت

تیرھویں صدی کے دو مجاہد

امیر المومنین سیدنا حضرت سید احمد صاحب شہید
اور حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب شہید

جناب غلام رسول صاحب "مہر" نے (اب سے چند سال پیشتر جب کہ وہ رزمگاہ حریت کے ایک آزاد مضمون نگار کی حیثیت سے روزنامہ "انقلاب" لاہور کی ادارت فرمایا کرتے تھے) تحریر فرمایا تھا۔

گزشتہ سو سال کی مدت میں ان دو جلیل القدر شخصیتوں کے متعلق اتنی غلط اور بے سروپا باتیں مسلمانوں میں پھیلائی جا چکی ہیں۔ کہ سارے ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں شاید عالمگیر اعظم کو مستثنےٰ کرنے کے بعد کسی شخص کے متعلق نہیں پھیلائی گئیں۔

ایک طرف جامدخیال علماء کا گروہ تھا جس نے اس افسوسناک تحریک میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ دوسری طرف اقتدار پرستوں کی سیاسی اغراض تھیں جو عام مسلمانوں کو اُن مجاہدوں کے متعلق انتہائی سوءِ ظن میں پھنسا کر ان کی قایم کردہ تحریک کو مٹانے کے درپے تھے۔

الغرض سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کے حقیقی خصائل پر خود ساختہ غلط افسانوں کی تہیں اس طرح جما دی گئیں کہ کوئی شخص آسانی سے حقیقت حال تک نہ پہنچ سکے۔

جن لوگوں کو اصلیت سے آگاہی تھی۔ اُن کا بڑا حصہ خود مخالفانہ پروپیگنڈے کے خوف و دہشت سے زبان کشا ہوتے ہیں متساہل رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان دو بزرگوں کے متعلق اُنکی زندگی میں اُنکی سچی مخلصانہ تحریک سے علیحدہ رہکر بلکہ اُس کی مخالفت کر کے جو نقصا۔۔ اُن کی شہادت کے بعد اُن کی شخصیتوں کو بدرجہا نقصان پہنچایا گیا ہے اور بدرجہا زیادہ بے انصافی کی گئی وہ جس مقصد کو لے کر اٹھے تھے۔ آج بظاہر اُسکی حیثیت بالکل بدلگئی ہے اور شاید وہ زمانہ نہیں رہا کہ مسلمان ٹھیک ٹھیک اُن کے نقش قدم پر چلیں لیکن مقصود حقیقی طریق عمل اور اسلوب کار نہیں بلکہ جوش عمل اور جذبہ کار ہی۔ جو ہر دور میں ہر فضا میں اور حالات کے ہر اجتماع کے ماتحت مختلف طریقوں اور اسلوبوں میں ظہور کرتا رہتا ہے۔

اس مضمون کی ترتیب و تدوین کا مقصد یہی ہے کہ اُس جوش عمل اور جذبہ کار کو عام مسلمانوں تک پہنچایا جائے۔ جو سید احمد صاحب بریلوی اور شاہ اسمٰعیل صاحب شہید کے ہر بن مو میں موجزن تھا۔ شاید یہ تذکرہ ہماری افسردگی کو دور کرنے میں مدد دے اور اگر اس ساکن سمندر کے

ے افسوس محترم "مہر" صاحب نے آج آپنے درس کو فراموش کر دیا۔ حریت پرور علماء مجاہدین کی جو جماعت اس درس عمل پر کاربند ہے۔ مہر صاحب اس کی تکفیر و تفسیق فرما رہے ہیں "ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا"۔

اندر ویساہی طوفان پیدا نہ ہو سکے۔ تو از کم اس کی سطح موجوں کی شکنوں سے تو محروم نہ رہے ۔ ےا

یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ صداقت خواہ کتنی ہی پوشیدہ ہو۔ باطل کے گرد و غبار کی اس پر خواہ کتنی ہی تہیں جم جائیں مگر انقلابات زمانہ کا دہی پردہ پوش ہاتھ جب تاریخ کا دوسرا ورق اُلٹتا ہے تو صداقت کے چہرہ کی نقاب کشائی کرتا ہے اور روئے حقیقت کا درخشاں آفتاب نصف النہار پر پہنچکر نعرہ لگاتا ہے

الحق یعلو و یعلی علیہ	حق بلند رہتا ہے ۔ اُس پر بلندی نہیں حاصل کی جاسکتی۔
جاء الحق و زھق الباطل	حق آیا ۔ باطل کافور ہوا ۔ بلاشبہ
ان الباطل کان زھوقا	باطل اسی لئے ہے کہ کافور ہو۔

آج جبکہ ہر ایک محب وطن غلامی کی زنجیروں سے آزردہ ہو کر ۔ گلو خلاصی کے لئے مضطرب ہے اور محبوبہ حریت کے وصال کی آرزو اس کے پژمردہ دل کو دوبارہ گدگدا رہی ہے ۔ تو اُس کی متجسسانہ نظریں قدرتی طور پر اُن بزرگوں پر پڑ رہی ہیں جو اسی تمنا اور حسرت میں جام شہادت نوش کر چکے ہیں ۔ اور اپنی بے قرار آرزو کو کسی کے عشوہ استبداد پر قربان کرتے

ےا شہید نمبر رسالہ الفرقان بریلی بابت ماہ شعبان ۱۳۵۸ھ صفحہ ۵۰

ہوئے حرم لیلائے شوق طواف میں جان عزیز تک فدا کر چکے ہیں۔ اس موقعہ پر جن بزرگوں کو قبلہ نما کی حیثیت دی جاسکتی ہے وہ یہی دو شہید ہیں جن کا نام نامی زیب عنوان ہے۔ اللّٰھم قدس سرّھما“

ان دونوں بزرگوں کی زندگیوں کا ایک حصہ تو بالکل ایکدوسرے سے پیوستہ ہے۔ لہٰذا اس کو مشترک طور پر بعد میں ذکر کیا جائیگا۔ اس موقعہ پر ہر ایک کے ابتدائی حالات جدا جدا بیان کئے جاتے ہیں۔

سیرت نگاروں کے تفصیلی بیان کے لئے تو کئی سو صفحات کی ضرورت ہے۔ ہم موضوع رسالہ کا لحاظ کرتے ہوئے مختصر طور پر کچھ حالات درج کرتے ہیں

حضرت سید صاحب کے ابتدائی حالات

ولادت اور وطن تیرھویں صدی کے پہلے روز یعنی یکم محرم الحرام سنہ ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء کو رائے بریلی (علاقہ اودھ) میں سید احمد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی ولادت باسعادت ہوئی

سلسلہ نسب آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی سید محمد عرفان[1] تھا۔ پسر سید محمد نور[2] پسر سید محمد ہدیٰ[3]۔ پسر سید محمد علم اللہ[4]۔ پسر سید فضیل[5]۔ پسر سید محمد معظم[6]۔ پسر سید احمد[7] پسر سید محمود[8]۔ پسر سید علاء الدین[9]۔ پسر قطب الدین[10]۔ پسر سید صدر الدین[11]۔ پسر سید زین الدین[12]۔ پسر سید احمد[13]۔ پسر سید علی[14]۔ پسر سید قیام الدین[15]۔ پسر سید صدر الدین[16]

لہ ماخوذ از سوانح احمدی و حیات طیبہ و ارواح ثلاثہ و حیات ولی و در المنثور،

پسر سید نظام[18] الدین۔ پسر سید قطب[19] الدین محمد الکرائی۔ پسر سید رشید[20] الدین احمد المدنی۔ پسر سید یوسف[21]۔ پسر سید عیسی[22]۔ پسر سید حسن[23]۔ پسر سید حسین[24] ابی الحسن پسر سید جعفر[25]۔ پسر سید[26] قاسم۔ پسر ابو محمد عبد[27] اللہ۔ پسر حسن[28] الاعور نقیب الجواد۔ پسر محمد[29] الثانی۔ پسر ابو محمد عبد[30] اللہ الاشتر۔ پسر ابو محمد[31] صاحب النفس الزکیہ۔ پسر عبد[32] اللہ محض۔ پسر حسن[33] مثنی۔ پسر حضرت امام حسن[34] مجتبیٰ۔ پسر سیدنا امیر المومنین علی[35] کرم اللہ وجہہٗ۔ ـلہ

یعنی ۳۵ واسطہ سے آپ کا سلسلہ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔

آپ کا خاندان اہل اللہ اور صاحب باطن بزرگوں کا سلسلہ تھا۔ آپ کے نانا سید ابو سعید اور چچا سید ابو نعمان بلند پایہ بزرگوں میں سے تھے۔ جن کا حضرت شاہ عبد العزیز صاحب بھی خاص احترام کرتے تھے۔ آپ کا خاندان "سادات تکیہ" کے نام سے مشہور تھا۔ ـٰہ

تعلیم۔ جب آپ کا سن مبارک چار سال چار ماہ چار یوم کو پہنچا تو آپ کو ایک مکتب میں بٹھایا گیا۔

تین برس آپ مکتب میں رہے۔ مگر چند سورتوں کے سوا آپ کو کچھ بھی یاد نہ ہوا۔ یہ حالت دیکھ کر باپ نے آپ کی تعلیم کا ارادہ ترک کردیا۔

زمانہ طفولیت کے مشاغل۔ آپ کو ابتدا سے جہاد اور خدمت خلق کا عشق تھا

ـلہ سوانح احمدی مصنفہ مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری ص۲۳۔ ـٰہ ایضاً ص۸۔ ـٰہ سوانح احمدی ص۷

آپ کا کھیل یہی ہوتا تھا کہ ہم عمر لڑکوں کا ایک لشکر جمع کر کے بطور جہاد باآواز بلند تکبیریں کہتے ہوئے کفار کے فرضی لشکر پر حملہ کرتے۔ اور وہ مارا۔ یہ فتح ہوا کی صدائیں آپ کے اس لشکر سے بلند ہوتیں [1]۔

تمام ضعیفوں۔ کمزوروں اور مسکینوں کے کام فی سبیل اللہ انجام دیتے تھے۔ بیوہ عورتوں کے گھروں پر جاکر احوال پوچھتے اور اُن کا ہر ضروری کام خوشی سے انجام کو پہنچاتے۔ جنگل کی لکڑیاں تک لا دیتے۔ اور۔ اور جو شخص کام کرا لیتا اس کا شکریہ ادا کرتے [2]۔

تیرہ چودہ سال کی عمر میں اپنے چچا صاحب سے قرآن پاک کا ترجمہ شروع کیا۔ قرآن پاک سے ذوق کا یہ عالم تھا کہ شب و روز اسی میں مشغول رہتے تھے۔ اور مزے لے لے کر تلاوت فرماتے۔ لیکن جب کوئی دوسری کتاب سامنے آتی تو انتہائی کوشش کے باوجود اس طرف توجہ ہی مبذول نہ ہوتی۔

سترہ سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ والدہ زندہ تھیں اس وقت سید صاحب کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کہیں ملازمت کی جائے اور خاندان کی کفالت کا فرض انجام دیا جائے۔

سفر لکھنؤ | اسی خیال کو مدنظر رکھ کر آپ چند رفقاء کے ساتھ لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ جو اس وقت حصول معاش کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ سواری ایک تھی۔ سارے رفیق باری باری اس پر سوار ہوتے تھے۔ مگر سید صاحب سارے سفر میں اپنی باری دوسرے ساتھیوں کو دیتے رہے۔ اور خود پیدل چلتے

---

[1] مخزن احمدیہ [2] مخزن احمدیہ۔

رہے۔ آدھی منزل طے ہو گئی تو رفیقان سفر نے تھک سامان اُٹھوانے کے لئے کسی مزدور کی تلاش شروع کی۔ سید صاحب نے سب کا سامان ایک کمبل میں باندھ کر خود اٹھا لیا۔ اور اس طرح لکھنؤ پہنچ گئے۔ رفیقان سفر نے بہت کچھ منت سماجت کی کہ اُن کا سامان انہیں کے حوالہ کر دیں۔ مگر سید صاحب کی منت اور خوشامد ہی ہوتی رہی کہ وہ سب کا سامان خود لے چلیں چنانچہ سید صاحب ہی اپنے اصرار میں کامیاب رہے۔

لکھنؤ اور اطراف ملک میں شیعہ سنی سوال اس زمانہ میں سختی سے چھڑا ہوا تھا۔ یہ حضرات جہاں جاتے یہی سوال پیدا ہوتا کہ شیعہ ہو یا سنی اس فرقہ وارانہ سوال نے تلاش روزگار میں بڑی مشکلات پیدا کر دیں جو کچھ تھوڑی بہت دام یہ لوگ گھر سے لیکر چلے تھے ختم ہو گئے تو سید صاحب کے رفقاء نے ٹوپیاں سی کر یا قلمی کتابیں لکھ کر بسر اوقات کی۔ البتہ سید صاحب کو ایک صاحب مل گئے۔ جو سادات سے محبت کرتے تھے۔ انہوں نے سید صاحب کا کھانا اپنے ہاں مقرر کر دیا۔ مگر سید صاحب اپنا کھانا اپنے ساتھیوں کو کھلا دیتے تھے اور خود روزے پر روزہ رکھ کر بسر کرتے۔

بظاہر سید صاحب کو کوئی ملازمت نہ ملی اور جہاں جہاں ملازمت ملنے کے مواقع نکلتے رہے اپنے ساتھیوں کو نوکر کراتے رہے۔ پھر آپ لکھنؤ کے خلفشار سے خاطر برداشتہ ہوئے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے زہد و تقوی کا چرچا سُن کر آپ مشتاق زیارت تھے۔ چنانچہ آپ اپنے ساتھیوں سے چھپ کر لکھنؤ سے روانہ ہوئے۔

راستہ میں آپنے ایک سپاہی کو دیکھا کہ وہ ایک کمزور بوڑھے کے سر پر ایک گھٹڑا اسباب کا رکھوائے ہوئے لیجا رہا ہے۔ آپکو مزدور پر بہت رحم آیا۔ آپ نے سپاہی کو نصیحت کرنی شروع کی۔ اور کمزوروں کے ستانے کے انجام بد سے آگاہ کرنے لگے سپاہی نے معذرت کی کہ میں نے اس کو بیگار میں نہیں پکڑ رکھا ہے۔ بلکہ اس کی مزدوری مقرر کر دی ہے۔

حضرت سید صاحب نے مزدور سے دریافت کیا۔ کہ اس نے ضعف اور پیری کے باوجود یہ سخت کیوں سہہ لی۔ اس بوڑھے نے سپاہی کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ میں دو روز سے فاقہ سے تھا آج یہ مزدوری ملی ہے پیٹ کا جہنم بھرنے کے لئے میں یہ محنت کر رہا ہوں۔

آپ نے منت سپاہی سے فرمائش کی کہ مزدور کی پوری مزدوری دے کر اس کو رخصت کر دو۔ اور یہ گھٹڑا آپ کے مکان تک میں پہنچا دوں گا۔

حضرت سید صاحب کی شریفانہ صورت دیکھ کر سپاہی اس پر آمادہ نہ تھا۔ مگر سید صاحب نے اتنی خوشامد کی کہ سپاہی کو مجبور ہو کر گھٹڑا سید صاحب کے حوالہ کرنا پڑا۔ جس کو سید صاحب نے سپاہی کے مکان تک پہنچایا۔

سپاہی کے مکان پر گھٹڑا پہنچا کر سید صاحب دہلی کی طرف روانہ ہوئے تو آپ کے پاس کل تین پیسے تھے۔ اور دہلی وہاں سے [illegible] منزل تھی۔ آپ نے ایک منزل چلکر ستو اور گڑ خریدا۔ مگر جب ستو گھول کر آپ پینے لگے۔ تو ایک مسکین نے کہا

"بابا کچھ اس بھوکے کو بھی جس کو چار وقت سے ایک دانہ نہیں نصیب ہوا"

حضرت سید صاحب نے وہ ستو اُس فقیر کو دیدئے۔

پانچ منزل کرنے کے بعد آپ ایک مسجد میں جاکر مقیم ہوئے۔ وہاں ایک شخص نے جو آپ کے والد کے مریدوں میں سے تھا۔ آپ کو پہچان لیا۔ اور آپ کو اپنے گھر لے گیا۔ آپ کے پاؤں سے خون جاری تھا۔ اس شخص نے آپ کو غسل دلایا۔ کپڑے پہنائے۔ پاؤں میں منہدی اور ببول کے پتوں کا لیپ کیا۔ اور جب آپ کے پاؤں اچھے ہوگئے۔ تو آپ کو سوار کراکر اپنے ساتھ دہلی لے گیا۔ [1] اس وقت آپ کی عمر کل بیس سال تھی۔

حضرت سید صاحب دہلی میں حضرت سید صاحب منزل مقصود پر پہنچے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے خاندانی تعارف کے باعث کمال شفقت فرمائی۔ اور دہلی آنے کا مقصد معلوم ہوا تو حضرت شاہ صاحب نے فرمایا "آپ کے خاندان میں تو منصب ولایت موروثی ہے۔ امید ہے کہ آپ بھی اپنے آباو اجداد کی طرح منزل مقصود پر فائز ہوں گے۔"

پھر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے تعلیم کے لیے سید صاحب کو اپنے برادر کوچک حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے پاس پہنچا دیا جو اکبرآبادی مسجد میں رہا کرتے تھے۔ اور چالیس سال متواتر اسی مسجد میں آپ نے اعتکاف فرمایا۔ پشت مبارک کے سہارا لگانے سے دیوار بھی گھس گئی تھی۔

---

[1] سوانح احمدی۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بھیاری نے آپکی صالحانہ صورت دیکھکر اپنے گھر رکھ لیا۔ اور بہت زیادہ خدمت کی جسکا قدرتی انعام اس کو یہ ملا کہ مکان کی ایک دیوار گر گئی جس میں سے روپیہ کی بھری تھلیا برآمد ہوئی۔ واللہ اعلم حیٰوۃ طیبہ۔ اسی طرح یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے اسی سفر میں کسی بوڑھے کو ۱۰ میل اپنی پشت پر سوار کرکے اس کے مکان پر پہنچایا۔ [2] حیٰوۃ طیبہ

سید صاحب نے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب سے روحانی تعلیمات
اور تلقینات کے ساتھ۔ قرآن پاک کا ترجمہ اور حدیث و تفسیر وغیرہ پڑھی
بیعت اور وطن کو واپسی ۱۲۲۲ھ ۱۸۰۸ء ہجری میں یعنی ۲۲ سال کی عمر میں
حضرت سید صاحب نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے دست صداقت
پر بیعت طریقت باضابطہ کی اور پھر کچھ عرصہ بعد خلعت خلافت سے
سرفراز ہو کر وطن واپس تشریف لے گئے۔
نکاح وطن پہنچکر آپ نے تقریباً دو سال قیام فرمایا اسی دوران میں آپ کی
شادی ہوئی اور ایک لڑکی تولد ہوئی۔
امیر خاں کی ملازمت ؎ اس زمانہ میں ضروریات زندگی پورا کرنے

؎ نواب امیر خاں کے حالات لکھنا اگرچہ موضوع کتاب سے خارج ہے مگر اس لئے
کہ اسلوب انقلاب اور طریق کار کے متعلق اس زمانہ اور موجودہ تفاوت
ظاہر ہو جائے۔ جس سے آئندہ مباحث کو متعلق ہے۔ مناسب معلوم ہوتا
ہے۔ کہ نواب صاحب موصوف کے کچھ حالات درج کر دئے جائیں۔

نواب امیر خاں صاحب کے دادا۔ طالع خاں۔ یاغستان کے پہاڑوں
میں موضع جوہڑ علاقہ بونیر کے اصل باشندے تھے۔ سالارزئی پٹھان تھے
محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں ہندوستان آئے۔ اور اپنے ایک دوست
زمان خاں جمعدار کی تحریک پر سنبھل ضلع مرادآباد کے محلہ سرائے ترین
میں سکونت اختیار کرلی۔ اون کے بیٹے محمد حیات خاں تھے۔ جو نواب

کا بڑا ذریعہ فوج کی ملازمت تھی۔ چنانچہ آپ نے وطن پہنچکر ۱۲۲۴ھ مطابق سنہ ۱۸۱۰ء میں نواب امیر خاں کی فوج میں ملازمت کی جو اس زمانہ میں جسونت راؤ ہلکر (مرہٹہ) سے معاہدہ کیئے ہوئے تھے اور انگریز اور ان مرہٹوں سے برسرپیکار رہتے تھے جو جسونت راؤ ہلکر کے مخالف تھے۔

دوندے خاں کی فوج میں ملازم ہو گئے تھے۔ اور نواب صاحب موصوف کی وفات کے بعد سنبھل میں قیام کر کے زراعت شروع کر دی۔ ۱۱۸۲ھ میں محمد حیات خاں کے بیٹے امیر خاں پیدا ہوئے۔ جب بیس سال کی عمر ہوئی تو تلاش ملازمت میں نکلے۔ مگر ناکام ہو کر ہمجنس دوستوں کو ساتھ ملا کر لوٹ مار شروع کر دی۔ پھر جیسے جیسے روپیہ فراہم ہونے لگا اپنی فوج بڑھاتے رہے۔ رفقا کے ساتھ حسن اخلاق اور ہمدردی کی حالت یہ تھی کہ کھانا اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھاتے۔ اگر اوروں کے پاس کچھ نہ ہوتا تو اپنا سامان بیچکر سب کو کھلاتے۔ نہیں تو سب کے ساتھ فاقہ کرتے۔ بہر حال اسی طرح بڑھتے بڑھتے امیر خاں کی فوج ہزاروں کی تعداد کو پہنچ گئی۔

جنوبی ہند میں اس زمانہ میں مرہٹے آپس میں دست و گریبان ہو رہے تھے اور انگریزی فوجیں ایک تیسری طاقت تھی جو موقعہ بموقعہ مرہٹوں کی کسی فریق کا ساتھ دیتی رہتی تھیں۔

مرہٹوں کا ایک راجکمار (شاہزادہ) جسونت راؤ ہلکر تھا۔ جس کو قومی دست مرہٹوں نے تاج و تخت سے محروم کر کے قید کر دیا تھا۔ وہ موقعہ پاکر قید

اس زمانہ میں فوجی کارناموں کے ساتھ شب بیداری کی حالت کی حالت یہ تھی کہ نفلوں میں کھڑے کھڑے آپ کے پاؤں ورم کر جاتے تھے۔

امیر خاں آپ کا بہت احترام کرتا تھا۔ اور غالباً آپ کا مرید تھا۔

چھ سال آپ نے امیر خاں کی فوج میں رہ کر مجاہدانہ خدمات انجام دیں۔ لیکن جب آپ کو محسوس ہوا کہ نواب امیر خاں انگریزوں سے صلح کرنا چاہتے ہیں ـــــ تو آپ استعفا دے کر دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ مولف صولت احمدی لکھتا ہے :-

ابھی صلح کی بات چیت طے نہیں ہوئی تھی کہ سید صاحب بعد قیام سات برس کے پھر لشکر نواب امیر خاں صاحب سے جدا ہو کر دوبارہ ۱۸۱۶ء (تقریباً ۱۲۳۱ھ) میں رونق افروز دہلی ہو گئے۔

سے فرار ہوا۔ اور ایک جماعت فراہم کر لی۔

امیر خاں کو اس نے غنیمت جانا۔ اور اُن سے معاہدہ کر لیا۔ چنانچہ تم و بیش پچیس سال متواتر جسونت راؤ کی معیت میں و کبھی مرہٹوں اور انگریزوں سے مقابلہ کرتے رہے۔ کبھی کوئی ضلع فتح کرتے اور کبھی کوئی رقبہ ہار جاتے اس دوران میں ایک مرتبہ راؤ رنجیت سنگھ سے بھی معاہدہ ہو گیا۔ اور سب نے ملکر انگریزوں سے مقابلہ کیا۔ مگر ہندوستان کے اقبال کا تارا غروب ہو رہا تھا انگریزوں کا اقبال عروج پر تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ساتھیوں نے یکے بعد دیگرے انگریزوں سے صلح کر کے ایک ایک ریاست لے لی۔ ۱۲۳۲ھ میں نواب امیر خاں نے ٹونک اور اس کے مضافات پر قناعت کر کے تاج برطانیہ کی ماتحتی قبول کی اور اس طرح ٹونک کی ریاست قائم کر لی۔ نواب امیر خاں مصنفہ اکبر شاہ خاں

نواب امیر خاں صاحب نے سید صاحب کی روانگی کے وقت نواب وزیر الدولہ بہادر۔ اپنے صاحبزادے کو ہمراہ رکاب کر دیا تھا۔ کہ وہ دہلی تک آپ کے ساتھ آئے۔

اپنے چلنے کے وقت آپ نے پیش گوئی کی تھی" اب جلد صلح ہو جائے گی اور فلاں فلاں شہر اور فلاں فلاں علاقہ سرکار انگریزی نواب صاحب کو دیگی۔ اور ایک زمانہ دراز گزرنے کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ میں ایک لشکر مجاہدین کا ساتھ لیکر نشانوں کے پھریرے اڑاتا ہوا نواب امیر خاں صاحب کے ملک سے گزروں گا ؎

ہر حال سید رح ۱۲۳۴ھ میں دہلی پہنچے تو وہ ایک شیخ کامل تھے۔

حضرت شاہ عبد العزیز صاحب حضرت شاہ عبد القادر صاحب نے اعزا اور احباب کو اپنے بجائے سید صاحب علیہ الرحمۃ کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ حضرت مولٰنا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہید۔ حضرت مولانا عبد الحی صاحب۔ مولانا وجیہ الدین صاحب۔ حکیم مغیث الدین صاحب۔ مولانا محمد یوسف صاحب نبیرہ شاہ اہل اللہ صاحب (برادر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب) جیسے حضرات جو صلاح و رشد میں مخصوص امتیاز کے مالک تھے مع اہل و عیال حضرت سید صاحب رح سے بیعت ہو گئے ؎

؎ سوانح احمدی ص۱۰۱ ؎ اس سوال کا کوئی شافی جواب نظر سے نہیں گزرا کہ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب اور سیدنا شاہ عبد القادر صاحب جیسے بزرگوں

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب سیدنا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ نے اپنے مخصوص تلامذہ اور معتقدین کی دو جماعتیں بنا دیں۔ ایک کا کام تھا کہ دہلی میں رہ کر درس و تدریس کی خدمت انجام دے۔ اس جماعت کو اپنی سرپرستی میں دہلی رکھا۔ حضرت شاہ اسحاق صاحب رح حضرت شاہ یعقوب صاحب رح اس جماعت کے سربر آوردہ ارکان تھے۔

دوسری جماعت کا فریضہ یہ مقرر کیا کہ وہ اطراف میں گشت کر کے تبلیغ اور اصلاح کرے۔ اس جماعت کے امام حضرت سید صاحبؒ تھے حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب شہید اور حضرت مولانا عبدالحی صاحب رح وزیر اور نائب کی حیثیت رکھتے تھے۔ (حضرت شہیدؒ کی جرأت اور قوت خطابت خاص شہرت رکھتی تھی۔ جوش تقریر سے پتھر کو موم کر دیتے تھے اور حضرت مولانا عبدالحیؒ صاحبؒ کو تفقہ اور علوم شریعت میں بصیرت کا مخصوص حصہ قدرت نے عطا فرمایا تھا۔

کے ہوتے ہوئے یہ حضرات حضرت سید صاحب سے بیعت کیوں ہوئے۔ مگر بظاہر اس کا سبب یہ ہے کہ حضرت سید صاحب رح کی طرح ان حضرات .... کی طبیعت بھی مجاہدانہ واقع ہوئی تھی۔ اور جس قدر زیادہ مناسبت شیخ اور مرید میں ہوگی اتنی ہی زیادہ اور جلد ترقی کر سکے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اس کا دوسرا سبب وہ ہے۔ جسکو مصنف سوانح احمدی نے لکھا ہے" مولانا محمد یعقوب صاحب فرمایا کرتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کی توجہ کی تاثیر ہلکی بارش کی طرح ہوتی ہے اور حضرت سید صاحب کی تاثیر کی مثال تو ہے کی جھکنی سی دینی چاہیے جو فوارہ کی طرح قلب پر پڑتی ہے ١٢..

: سوانح احمدی صفحہ ١١

سوانح نگار حضرات نے اگرچہ اس جدوجہد کو تبلیغی قرار دیا ہے مگر جب بھی یہ پیش نظر ہو کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہٗ العزیز ہندوستان کو دارالحرب قرار دے چکے تھے۔ جس کا دوبارہ دارالاسلام بنانا فریضہ مسلم ہی تو قدرتی طور پر یقین ہو جاتا ہے کہ یہ تمام جدوجہد سیاسی تھی۔ اگرچہ تبلیغ کا اہم مقصود بھی اس سلسلہ میں حاصل ہو رہا تھا اور انشاءاللہ آئندہ واضح کیا جائے گا کہ تدریس و تعلیم کی جماعت اگرچہ اپنے مشغلہ میں قوت کے ساتھ مشغول رہی۔ مگر دوسری جماعت کی جدوجہد سے بھی اُس کا گہرا تعلق رہا۔ بلکہ حضرت سید صاحب کے پشاور تشریف لے جانے کے بعد ہندوستان سے مجاہدین کی روانگی تعلیمی جماعت کے ذریعہ سے ہی ہوتی رہی۔

سیدنا حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہید رح کے مخصوص حالات

ولادت یہ پہلے گزر چکا ہے کہ حضرت شہید قدس اللہ سرہ العزیز سیدنا شاہ عبد الغنی صاحب خلف رشید حضرت سیدنا شاہ ولی اللہ صاحب رح کے فرزند ارجمند تھے

آپ کی ولادت[1] ۱۲ ربیع الثانی ۱۱۹۳ھ مطابق ۱۷۷۸ء کو ہوئی[2]

آٹھ سال کی عمر میں آپ نے قرآن شریف حفظ کر لیا اور پھر دو تین سال کے عرصہ میں فارسی اور عربی کی صرف ونحو میں مہارت حاصل کر لی۔ ۱۲ سال کی عمر میں آپ صدرا پڑھا کرتے تھے۔

ذکاوت اور ذہانت کی یہ حالت تھی کہ ایک ہی نظر میں مشکل سے مشکل عبارت کی تہ کو پہنچ جاتے۔

باوجودیکہ صدرا فلسفہ کی مشکل ترین کتاب ہے جس کا آدھ صفحہ بمشکل ایک گھنٹہ میں سمجھایا جاتا ہے۔ مگر آپ اس کے پانچ چھ صفحے ایک گھنٹہ میں پڑھ لیتے۔ اور استاد کے بتائے بغیر تمام مضمون پر حاوی ہو جاتے تھے۔

بقول مصنف حیات طیبہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان میں دستور تھا کہ وہ سب سے پہلے اقلیدس کی شکلیں بچوں کو پڑھاتے تھے۔ تاکہ طبیعت کی ذکاوت کا اندازہ ہو جائے۔ پھر ریاضی۔ حساب۔ جغرافیہ۔ تاریخ

---

[1] یعنی آپ اپنے پیر مرشد حضرت سید صاحب سے تقریباً سات سال عمر میں بڑے تھے۔ [2] حیات طیبہ۔ الفرقان شہید نمبر وغیرہ۔

وغیرہ بھی مخصوص طور پر پڑھائی جاتی تھی۔ چنانچہ حضرت شہید رحؒ نے ان فنون میں بھی بہت کافی مہارت حاصل کی تھی۔ اور پھر آخر میں حدیث شریف سیدنا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے پڑھ کر تقریباً ۱۶ سال کی عمر میں جملہ علوم و فنون سے فراغت حاصل کر لی۔

یہ مشہور ہے کہ درس کی کتابیں حضرت شاہ صاحب نہ دیکھ کر پڑھتے تھے نہ پڑھ کر دیکھتے تھے۔ مگر قوت حافظہ اور ذکاوت کا یہ عالم تھا کہ ایک نظر میں ہی مضمون کتاب پر حاوی ہو جاتے تھے۔

ورزش فنون حربیہ سے حضرت شاہ صاحب کو فطری شوق تھا۔ آپ نے گھوڑے کی سواری میاں رحیم بخش "چابک سوار" سے سیکھی تھی۔ جو اگرچہ پہلے کچھ دیندار نہ تھا مگر حضرت شہید رحؒ کے فیض صحبت سے تائب ہو کر حضرت موصوف کے لشکر میں شریک ہوا۔ اور سکھوں سے جنگ کرتا ہوا شہید ہوا۔

حضرت شاہ صاحب چالیس چالیس میل گھوڑے پر سوار ہو کر گھوم لیتے تھے اور تکان محسوس نہ ہوتا تھا۔

گھوڑے کی سواری میں مشق حاصل کر لینے کے بعد آپ نے پٹے بازی مرزا رحمۃ اللہ بیگ سے سیکھی۔ اسی طرح متعدد اساتذہ سے بنوٹ، تلوار بازی وغیرہ جملہ فنون سپہ گری میں پوری مہارت حاصل کر لی۔ اپنے نشانہ پر خود آپ کو ناز تھا۔

ایک مرتبہ آپ نے فخریہ فرمایا۔ یہ ناممکن ہے کہ جانور میرے سامنے آئے اور زندہ نکل جائے

کسی ساتھی نے ہنسکر کہا: "اگر موت ہی نہ ہو" تو مولانا نے فوراً جواب دیا: "وہ میرے سامنے ہی نہ آئے گا"

پھر آپ نے پانی میں تیرنے کی مشق کمال کو پہنچائی تین تین روز متواتر پانی میں رہتے محض نماز کے لیئے باہر آتے - بارہا دہلی سے آگرہ جمنا میں تیر کر تشریف لے گئے اور واپس ہوئے۔
جس چیز کو آپ شروع کرتے پورے شغف کا اظہار کرتے - اور کمال حاضر کرتے تھے اور کمال حاصل کئے بدون کبھی نہ چھوڑتے تھے۔ تیراکی کی مشق کے زمانہ میں شغف کا یہ عالم تھا کہ طلبہ کو حکم تھا کہ وہ لب دریا حاضر ہو کر سبق پڑھا کریں۔ مشہور یہ ہے - کہ تین سال یا چار سال آپ نے اسی طرح پانی میں زندگی بسر کی۔
جب تمام فنون میں مہارت حاصل کرلی تو جفاکشی کی طرف توجہ کی۔ آپ دھوپ میں ننگے پاؤں دوڑتے اور ایک ایک سانس میں آٹھ آٹھ دس دس میل نکل جاتے۔ دوڑ دوڑ کر درختوں پر چڑھتے۔
پھر تپتی ہوئی زمین پر آہستہ آہستہ ننگے پاؤں چلنے کی مشق بہم پہنچائی - جامع مسجد اور فتح پوری کے فرش پر دھوپ میں گھنٹوں ننگے پاؤں پھرتے رہتے۔ کبھی دھوپ میں بیٹھ جاتے اور گھنٹوں بیٹھے رہتے - پھر اپنے آپ کو جاڑوں کا عادی بنایا - دیر تک بھوکے پیاسے رہنے کی مشق بہم پہنچائی - یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا - تو سونا چھوڑ دیا - آٹھ آٹھ دس

دس روز مسلسل بیدار رہتے۔ آخر اس باب میں اتنا کمال حاصل ہو گیا
کہ جب چاہتے۔ سوتے اور جب چاہتے بیدار ہو جاتے

غرض اپنے جسم کو کلیتہً اپنے عزم وارادہ کا مطیع بنا لیا۔ دنیا کی ہر
تکلیف۔ ہر رنج۔ ہر سختی سے بالکل بے پرواہ ہو گئے۔

اصلاح کی پہلی آواز اب حضرت شہید نے وعظ کا سلسلہ شروع کیا۔
سب سے پہلا وعظ توحید کے متعلق دہلی کی جامع مسجد میں ہوا۔ جس میں آپ
نے بدعات اور محدثات کے رد کے ساتھ حقیقی اسلامی توحید کا نقشہ پیش
کیا۔ یہ آواز دہلی کی جامد فضا میں بالکل نئی اور اجنبی تھی۔ اس وعظ پر عوام
میں شورش بپا ہوئی۔

(آج کل لیگ اور کانگریس کی کشاکش کے دور میں یہ بات بہت
زیادہ عجیب معلوم ہوگی کہ اس وعظ کا کاتب ایک ہندو "ہیرالال" تھا۔
جو حضرت شہید رحہ کے ہاں محرری کی خدمات انجام دیتا تھا[1]

---

[1] حیات طیبہ صـ۳۷

حضرت شہیدؒ کی علمی اور تبلیغی خدمات

سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے حالات میں اُس زمانہ کے غیر سیاسی ماحول بیان کرتے ہوئے۔ اُن بدعتوں اور گمراہیوں کا مختصر ذکر آچکا ہے جن کی گھنگھور گھٹا نے ہندوستان کی فضا کو تیرہ و تار کر رکھا تھا۔

اس وقت اُن حالات کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ یہاں اجمالی طور پر مختلف کتابوں سے اخذ کر کے حضرت شہید رح کی خدمات درج کی جاتی ہیں جن سے اُس تاریک فضا کا مزید اندازہ بھی ہو جائے گا۔

علمی خدمات حضرت شاہ صاحب رح کی سپاہیانہ زندگی کے ساتھ جب علمی خدمات پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ یگانہ روزگار ایک مافوق الفطرت حیات کا مالک ہے جس کی مثال کے لئے تمام دنیا کی تاریخ میں چند نفوس کے سوا زائد افراد نہیں مل سکتے۔ کاش ہندوستان کا اقبال عروج پر ہوتا اور اس شہید ملت کو کامیابی نصیب ہوتی تو سکندر اعظم۔ نپولین سے کہیں زیادہ اس کی ثناخوانی کی جاتی۔ اور اپنے زمانہ کا سب سے بڑا انسان اسی شہید حریت کو ثابت کیا جاتا۔

آپ نے تحصیل علوم کے بعد اپنے اسلاف کے طریقہ پر تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ طلبہ جوق جوق آپ سے مستفیض ہوتے۔

علمی بصیرت اور دقت نظر کی یہ حالت تھی کہ مولانا سید بیالدین حسنی

خلف مولانا رشید الدین صاحب جن کا ہزار ہا روپیہ کا کتب خانہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں دہلی میں تباہ ہو گیا تھا۔ فرمایا کرتے تھے۔

"جو کتابیں ضائع ہوئیں وہ پھر بھی دستیاب ہو سکتی ہیں۔ افسوس اُن حاشیوں کا ہے جو حضرت شہید نے مختلف کتابوں پر تحریر فرماتے تھے۔ جن کے فقدان سے بیش بہا علمی نکات معدوم ہو گئے [۱]"

آپ کے وعظ میں اُس زمانہ کے بڑے علماء شریک ہوتے تھے علمی نکات سے مستفیض اور محظوظ ہوتے۔

ایک مرتبہ ایک رکوع تلاوت کیا۔ مولوی امام بخش صاحب صہبائی۔ مولانا عبداللہ خاں صاحب مفتی صدر الدین صاحب وغیرہ شریک تھے۔ اس رکوع کے متعلق ایسی عجیب و غریب تفسیر فرمائی کہ یہ سب حضرات دوبارہ اس رکوع کی تفسیر سننے کے متمنی ہوئے۔ مگر دوسرے وعظ میں اگرچہ رکوع وہی تھا لیکن جو نکات بیان فرمائے گئے۔ وہ پہلے سے زیادہ عجیب تھے [۲]

غرض ہر وعظ میں عجیب و غریب نکات بیان کئے جاتے جو جدید اور بالکل تازہ ہوتے۔

ایک روز حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے ایک فتویٰ تحریر فرمایا۔ اور اس کو باہر چھوڑ کر کسی ضرورت سے اندر تشریف لے گئے۔ اتفاق سے مولانا شہید وہاں پہنچ گئے۔ فتوے کو دیکھنے لگے اور اپنی خداداد ذکاوت سے اُسکی

---

[۱] سوانح احمدی صفحہ ۱۴۰ [۲] سوانح احمدی صفحہ ۱۴۶ تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو ارواح ثلاثہ وغیرہ۔

فروگذاشتوں کی اصلاح کردی. حضرت شاہ صاحب نے واپس آکر جب فتوے پر ترمیم و اصلاح کو دیکھا تو بہت مسرور ہوئے اور فرمایا "الحمد للہ - ابھی ہمارے خاندان میں علم باقی ہے"

ایک طرف حضرت شاہ صاحب کی سیاسی دلچسپی تبلیغی جد و جہد اور سپاہیانہ زندگی پر نظر ڈالو - اور پھر سوانح نگاروں کے اس متفقہ بیان پڑھو کہ حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب نہ پڑھ کر دیکھتے تھے اور نہ دیکھ کر پڑھتے تھے - اور اس کے بعد حضرت موصوف کی تصانیف کا مطالعہ کرو تو یقین ہو جائے گا کہ خدا نے علم لدنّی کا کوئی سلسلہ دنیا میں قائم کر رکھا ہے جس سے ہم جیسے ظاہر پرست اگرچہ محروم ہیں - مگر شاہ اسمٰعیل صاحب جیسے بزرگان ملت کو اس کے لئے منتخب اور اس دولت سے مالا مال کیا جاتا ہے -

حضرت شاہ صاحب کی تصانیف میں "منصب امامت" آپ کے علمی تبحر - دقتِ نظر کا بہتر نمونہ ہے -

جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے علوم شریعت کو نہ صرف نماز روزے کے لئے پڑھا تھا - بلکہ آپ نے شرعی سیاست کا بھی مجتہدانہ نظر سے عمیق مطالعہ کیا تھا -

خلافت اور امامت کیا چیز ہے - اس کے متعلق منشاء شریعت کیا ہے اور کن کن صورتوں میں وہ حاصل ہو سکتا ہے - ان تمام مباحث کے متعلق عجیب کتاب ہے - فجزاهم الله عنا احسن الجزاء

تبلیغی خدمات اور امکان کذب وغیرہ مسائل کی ایجا

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ حضرت شاہ اسمعیل صاحب قدس سرہ سے جب ان خرافات اور مشرکانہ رسوم پر ضبط نہ ہو سکا جو اس زمانہ میں عوام اور خواص کا شیوہ بنی ہوئی تھیں تو آپ نے جامع مسجد میں ایک تقریر کی۔ جس کا اثر یہ تھا کہ جو اس وعظ کو سننے والے تھے وہ حضرت شاہ صاحب کے ہم خیال تھے اور جو اس وعظ میں شریک نہ تھے مخالف تھے۔ گھر گھر یہی چرچا تھا۔

اس وعظ کا موضوع کون سی آیت تھی۔ اس کے متعلق سوانح نگار حضرات کے بیانات مختلف ہیں۔ احقر نے حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اور حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمہما اللہ مہتمم دار العلوم دیوبند سے سنا تھا کہ موضوع وعظ یہ آیت تھی۔

لَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔	تیرے رب کی قسم وہ مومن کہلانے کے مستحق نہیں جبتک اپنی تمام نزاعات میں آپ کو ثالث نہ مان لیں۔ پھر آپ جو کچھ فیصلہ فرمائیں اسپر اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پوری طرح سر تسلیم خم کر دیں

اس آیت کو سامنے رکھ کر تمام مراسم اور عقائد پر تنقید کی جا سکتی ہے۔ کہ آیا شرعی نصوص سے اُن کے متعلق کوئی دلیل ہے یا نہیں۔

طرز تقریر ایسا دلچسپ اور مدلل تھا کہ مخالف سے مخالف بھی رام ہو جاتا تھا۔ آپ کے طرز استدلال کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے۔

ایک بڑھیا جو مولانا اسمٰعیل صاحب کو پہچانتی نہ تھی۔ مولانا اسمٰعیل

صاحب سے کہنے لگی۔
یہ موا اسمٰعیل کون ہے۔ جو بی بی کی صحنک کو منع کرتا ہے۔
مولانا اسمٰعیل صاحب نے برجستہ جواب دیا۔ اسمٰعیل نہیں منع کرتا۔ بی بی جی کے ابا نے منع کیا ہے۔ بوڑھیا فوراً چونکی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ تائب ہو گئی۔
بہر حال حسن خطابت اور عمدگی استدلال کا نتیجہ یہ تھا کہ پہلے ہی وعظ نے اس قدر گرویدہ کر لیا کہ لوگ آپ کے وعظ کے مشتاق رہنے لگے۔ جہاں کہیں وعظ ہوتا خلقت کا ہجوم سمندر کی موجیں لینے لگتا۔
تقریری تبلیغ کے ساتھ آپ نے تحریری تبلیغ بھی شروع کی۔ چنانچہ "تقویۃ الایمان" اُسی زمانہ میں تصنیف فرمائی۔
حضرت شاہ صاحب کے وعظ کا اثر اُن لوگوں کے لئے پیغام موت تھا جو مشرکانہ اور ابلہ فریب ڈھکوسلوں سے دنیا کو لوٹتے تھے۔
علاوہ ازیں جاہ پسند حضرات کو بھی رشک تھا کہ حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب کی مقبولیت عوام میں روز افزوں ہے۔
مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی۔ فلسفہ اور منطق کے مشہور ... ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے جو ریزیڈنٹ بادشاہ کے ہاں رہتا تھا اُس کے سر رشتہ دار تھے۔ حسن کارگزاری۔ سلیقہ اور اپنی قابلیت کے باعث ریزیڈنٹ کی نظر میں آپ کا احترام تھا۔ حتیٰ کہ بادشاہ بھی آپ کا احترام کرتا تھا۔ اور ریزیڈنٹ صاحب کے منظور نظر ہونے کے سبب سے دہلی کے تمام سرکاری

علمائے مولانا فضل حق صاحب کا احترام کرتے تھے۔
سرکاری خدمات کے ساتھ تدریس کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ خالی اوقات میں طلبہ کو منطق اور فلسفہ کا درس بھی دیتے تھے۔
بدقسمتی سے اس جماعت نے (جس کے ذاتی مفاد اور لوٹ کھسوٹ پر حضرت شاہ صاحب کی تقریر کا تباہ کن اثر پڑ رہا تھا) مولانا فضل حق کا سہارا ڈھونڈا۔ اور اُن کو اپنا امام بنا لیا۔ چنانچہ مولانا فضل حق صاحب نے خود پسند اور برخود غلط مولویوں کی طرح۔ اول تو طلبہ کو سکھا پڑھا کر حضرت مولینا اسماعیل صاحب شہید کے درس میں بھیجنا شروع کیا۔ مگر جب اس کا اثر اُلٹا پڑا اور طلبہ جو سخن فہمی کا سلیقہ رکھتے تھے خود مولانا فضل حق سے جدا ہو کر حضرت شہید کے حلقہ بگوش عقیدت ملنے لگے تو تقویۃ الایمان کی عبارتوں، نیز آپکی اصلاحات پر نکتہ چینی شروع کر دی۔ اور وہ مسائل جن کا تذکرہ بھی عوام میں شرعًا جائز نہیں مولانا فضل الحق کی منطقی موشگافیوں سے عام مسلمانوں کے جنگ و جدال کا موضوع بن گئے (انا للہ وانا الیہ راجعون)
مگر مولانا کی مقبولیت اب بھی روز افزوں تھی۔ تو دوسری سبیل اختیار کی گئی۔
باشندگان دہلی کے پندرہ سو شخصوں سے ایک محضر نامہ مرتب کیا گیا۔ جو ریزیڈنٹ بہادر کی بارگاہ میں پیش ہوا۔ جس پر نقض امن کے خطرہ سے ریزیڈنٹ صاحب نے وعظ کی ممانعت کا حکم صادر فرمادیا۔
لیکن اس زبان بندی سے جو غالبًا سرزمین دہلی میں "جدید بدعت" تھی

عوام میں ہیجان پیدا ہوا۔ اور بقول مرزا حیرت صاحب حضرت مولانا شہید نے
بھی ریزیڈنٹ کے پاس ایک تحریر بھیجی۔ جس میں زبان بندی کے حکم سے متعلق
۸۰ خرابیاں درج کی تھیں۔ اس کے جواب میں ریزیڈنٹ نے زبان بندی کا
حکم واپس لے لیا۔ مگر واپسی کے حکم کو سررشتہ دار صاحب نے اپنے سفینہ
میں دبا کر رکھ لیا۔ جب انتظار کرتے کرتے کئی روز گزر گئے اور کوئی جواب نہ
ملا تو حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب خود ریزیڈنٹ سے ملے۔ اور گفتگو کی۔ اور جب
ریزیڈنٹ کو معلوم ہوا کہ اجازت وعظ کا جو حکم چند روز پہلے لکھا گیا تھا۔
وہ سررشتہ دار صاحب کی مہربانی سے اب تک دفتر ہی میں ہے۔ تو سررشتہ
دار صاحب پر بہت خفا ہوا۔ اور تین ماہ کے لئے معطل کر دیا۔

مگر مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری فرماتے ہیں

" لیکن خلقت شہر کی آپ کے وعظ پر شیدا تھی۔ مجبوراً بادشاہ کو
جامع مسجد میں آپ کے وعظ کی اجازت پھر دینی پڑی [1]

بہر حال اس سلسلہ میں چالیس روز حضرت شہید کا وعظ بند رہا۔
اس تمام نزاعی قضیہ کا بانی سوانح نگار حضرات نے مولانا فضل حق
صاحب کو قرار دیا ہے۔

مگر گورنمنٹ برطانیہ کی مشہور پالیسی کہ تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو نہ
کے پیش نظر ہمیں یقین کرنا پڑتا ہے کہ مولانا فضل صاحب محض آلہ کار تھے۔

---

[1] سوانح احمدی ص ۱۴۲

معطل کرنا وغیرہ سب انگریزی ڈپلومیسی کی معمولی حرکتیں ہیں[1]۔ باقی محضر نامہ مرتب ہونا نقص امن کا خطرہ وغیرہ۔ یہ انگریزی ڈپلومیسی کا ادنیٰ کرشمہ تھا۔

اس زمانہ کے بھولے بھالے ہندوستانی اس قسم کی چالبازیوں سے واقف نہ تھے۔

وہ نقص امن کے خطرہ پر انگریز بہادر کے احسانات کو فرشتہ امن کا حیات بخش پیغام تصور کرنے لگے تھے۔

مگر یہاں تو عوام کے اضطراب نے اور پھر بادشاہ یا ریزیڈنٹ صاحب کی جانب سے صرف چالیس روز بعد حکم واپس لے لینے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں کی مرضی کے برخلاف یہ ایک جل تھا۔

بہرحال حضرت شہید رح کے وعظوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔

جہالت اور لاپرواہی کی انتہا ہوگئی کہ جامع مسجد میں حوض کے کنارے پر بازار لگا کرتا تھا جس میں ہندو مسلمان سب ہی دوکانیں لگاتے تھے۔

---

[1] اس کی مثال صدہا واقعات سے دی جاسکتی ہے۔ مثلاً ۱۹۱۴ء و ۱۹۱۵ء میں یورپ کی عالمگیر جنگ ہوئی جس کے نتیجہ میں ترکی سلطنت کے حصے بخرے کئے گئے جرمنی کے تمام نوآبادیات فاتحین نے آپس میں تقسیم کرلیں۔ اور پھر کمزور طاقتوں کے تحفظ اور انسانی خون کی حرمت کے نام پر "لیگ آف نیشن" جمعیتہ الاقوام قائم کی گئی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد جاپان نے چین پر حملہ کیا۔ چین کی کمزور بے کس مخلوق پر آگ اور خون کی بارش برسائی۔ مگر جمعیتہ الاقوام کی حالت وہی رہی کہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔ جاپان نے منچوریا وغیرہ پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد اٹلی نے حبش پر حملہ کیا۔ شاہ حبش نے

حضرت شہید کو یہ شرمناک حرکت کب برداشت ہو سکتی تھی۔ اسپر شدید احتجاج کیا۔ چنانچہ فرمان شاہی کے بموجب یہ بازار موقوف ہوا۔

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہزار ویلا کی۔ وفود بھیجے۔ خود جمعیتہ الاقوام کے اجلاس میں حاضر ہوا۔ مگر جمعیتہ الاقوام کی جانب سے انتہائی کارروائی یہ تھی کہ تقریباً چالیس حکومتوں کے اتفاق سے اٹلی کا بائیکاٹ منظور رہا۔ مگر ابتک یہ تجویز بروئے کار نہ آئی تھی۔ کہ اٹلی نے زہریلی گیس پھینک کر حبش کو برباد کردیا۔ اور اپنے خونخوار فوجوں کو تمام ملک میں پھیلادیا۔ شاہ حبشہ پھر جمعیتہ الاقوام کے حرم کا طواف کرتا رہا۔ لیکن آخر کو صاف جواب مل گیا۔ اور اٹلی کا قبضہ حبشہ پر تسلیم کرلیا گیا۔ جرمنی نے اقدام کیا اور ۱۹۳۸ء میں زیکوسلویکیا کے علاقوں پر قبضہ کرلیا جمعیتہ الاقوام نہ صرف خاموش رہی بلکہ جرمنی کے سامنے سرنگوں ہوگئی۔ انتہا یہ کہ چیمبرلین (جوآج کل برطانوی وزیراعظم ہے) اس نے اعلان کردیا کہ دوسروں کے لئے کسی ایک برطانوی سپاہی کا خون بہانا بھی ہمارے نزدیک حماقت ہے۔

دوسری مثال) ہندوستان میں تحریک آزادی چل رہی ہے ۱۹۳۱ء میں جب یہ تحریک قوت پر تھی تو وزارت پر لیبر پارٹی یعنی مزدور پارٹی کا قبضہ تھا۔ اس نے خوش آیند عذروں سے ہندوستانیوں کو کسی قدر مطمئن کیا لارڈ ہیلی فیکس جو لارڈ ارون کے نام سے مشہور تھے ہندوستان کے وائسرائے تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے ڈکٹیٹر مسٹر گاندھی سے مفاہمت کی۔ تحریک بند کردی گئی۔ لیکن ۱۲ ماہ نہ گزرے تھے کہ وہ وزارت توڑدی گئی۔ تمام دعوے گاؤخورد ہوگئے۔ اور اب ہندوستان کا وائسرائے ویلنگڈن ہوکر آیا۔ جس نے (بقیہ صفحہ پر

آپ کو تبلیغ اور اصلاح خلق کا اس قدر شوق تھا کہ گلی کوچوں اور بازاروں حتے کہ طوائف کے بالا خانوں پر بھی پہنچ کر تلقین کرتے۔

ایک مرتبہ آپ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسہ کے دروازہ پر کھڑے ہوتے تھے۔ کچھ جوان عورتوں کو دیکھا جو آراستہ اور پیراستہ ہو کر گاڑیوں میں سوار جا رہی تھیں۔

اُن کی بے باکانہ اور بے شرمی پر آپ کو تعجب ہوا۔ دریافت فرمایا یہ عورتیں کون ہیں۔ جواب دیا گیا بازاری عورتیں ہیں کسی تقریب میں شرکت کے لئے جا رہی ہیں۔

حضرت شہید نے فرمایا۔

کیا وہ مسلمان نہیں۔ اور جب کہ وہ مسلمان ہیں تو ان کو سمجھانا ضروری ہے۔ ورنہ قیامت کے روز ہم سے بھی بازپرس ہو گی کہ تم نے تنبیہ تہدید کیوں نہیں کی۔

آپ سے کہا گیا کہ حضرت ان کے پیچھے مت پڑیے۔ ورنہ نہ معلوم کیا کیا الزام لگائے جائیں گے۔ حضرت شہید نے ان کے اس بزدلانہ جملہ سے بالا ہو کر فرمایا۔ مجھے تبلیغ ضرور کرنی ہے۔ میں ہر فرض ہو سکا دفن ہو جاؤں۔ آیندہ جائیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) انتہائی تشدد اور سختی کے ذریعہ سے سابق وعدوں کا خوشگوار ایفا کیا۔ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ جو پہلے لیبر پارٹی کے وزیر تھے وہ کنزرویٹو بن گئے۔ اور جدید وزارت کے بھی وزیر اعظم ہو گئے۔ بہرحال کسی وعدے کو ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کیلئے وزارت کی تبدیلی معمولی چیز ہے۔ اس قسم کے سیکڑوں واقعات عالم آشکار ہیں۔

رہی بدنامی تو راہ خدا میں جو اذیت بھی پہنچے سعادت ہے۔
اگر مجھے ہاتھی کے پاؤں میں ڈالدیا جائے۔ توپ سے باندھکر اڑادیا جائے یا کالا منھ کر کے گدھے پر سوار کیا جائے اور بازاروں میں گھمایا جائے تو میں ہر حالت میں سیدنا بلال رضؓ کی سنت پہ عمل کروں میری زبان اعلان حق میں مصروف رہیگی۔ اور میری جدوجہد۔ اعلاء کلمۃ اللہ پر صرف ہوگی۔

در رہ منزل لیلےٰ کہ خطرہاست بجاں
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

بہرحال حضرت شاہ صاحب نے نماز مغرب کے بعد فقیرانہ لباس زیب تن فرمایا۔ اور اس کوٹھے پر تشریف لے گئے۔ جہاں ان سب کا اجتماع تھا۔ باہر سے دروازہ بند تھا۔ آپ نے دستک دی۔ کچھ چھوکریوں نے دروازہ کھولکر پوچھا کون ہے۔ آپ نے جواب دیا۔ فقیر ہے کچھ صدا لگانا چاہتا ہے۔ مختصر یہ کہ آپ نے ایسے رقت انگیز اور عبرت خیز طرز پر اُن کو سمجھایا کہ اُن سب رقت طاری ہوگئی حتیٰ کہ توبہ کی اور نکاح کر کے ساری زندگی شرافت اور عصمت کے ساتھ گذار دی۔

لہ حیات طیبہ۔ ارواح ثلٰثہ۔ مگر ارواح میں رنڈی کا نام موتی لکھا ہے اور تفصیل واقعہ میں کچھ تفاوت ہے۔ ملاحظہ ہو ص۱۵ و ص۱۵۳ ارواح ثلٰثہ حضرت امیر شاہ خاں صاحب خادم خاص حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رح (باقی اگلے صفحہ پر)

ایک روز آپ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے وعظ فرما رہے تھے
ایک ہیجڑے کی قسمت جاگی۔ آکر آپ کا وعظ سُننے لگا۔ زیادہ دیر نہ گزری
تھی کہ وہ فرطِ رقت سے بے تاب ہو گیا۔ سارا سنگار اتار پھینکا۔ چوڑیاں
توڑ دیں۔ ریشمی کپڑے پھاڑ دئیے اور مہندی کا رنگ چھڑانے کے لئے
ہتھیلیوں کو پتھروں سے رگڑنے لگا۔ پھر یہی مخنث حلقہ بگوش عقیدت
ہو کر فوج میں داخل ہوا۔ اور سکھوں کے مقابلہ پر دادِ مردانگی دیتا ہوا یہ
دہلی کا ہیجڑا شہید ہوا۔

جامع مسجد دہلی کے شمالی مشرقی گوشہ میں ایک حجرہ مقفل رہتا ہے۔
اور اُس پر گنبد بھی ہے۔ اُس زمانہ اس میں کچھ تبرکات رہا کرتے تھے۔ اکبر
شاہ ثانی کا دور تھا۔ (جس کی حدِ حکومت قلعہ اور شہر تک محدود کر دی
گئی تھیں) یہ تبرکات مقررہ اوقات پر بادشاہ کے سامنے دربار میں لے جائے
جاتے تھے۔ بادشاہ کچھ نذر نیاز پیش کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت شہید
جامع مسجد کی حوض پر بیٹھے ہوئے وعظ فرما رہے تھے۔ تبرکات حجرہ سے
نکالے گئے۔ بہت سے آدمی ان کے احترام میں سرو قد ہو گئے۔ شہید موصوف
اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔ لوگوں نے رو برو اعتراضات کئے۔ اور بہت ممکن
تھا کہ فوجداری ہو جاتی۔ مگر حضرت شہید کے علم اور آپ کی جماعت کی مدافعت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کی بیان فرمودہ حکایات کا مجموعہ ہے۔ خانصاحب کا کمال
یہ تھا کہ جملہ واقعات انکو سند اور حوالہ کے ساتھ لفظ بلفظ محفوظ تھے۔ اس کتاب
میں سند اور حوالوں کا بھی ہر حکایت کے ساتھ ذکر ہے۔ اکابر کے حالات کے متعلق

نے یہ نوبت تو نہ آنے دی۔ البتہ بادشاہ کے کان خوب بھرے گئے بادشاہ اس خاندان کا احترام کرتا تھا۔ اُس نے حضرت شہید کو طلب کر لیا۔ اور حضرت شہید کا بیان لیا۔ آپ نے تمام واقعہ بیان فرمانے کے بعد فرمایا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ تبرکات مصنوعی ہیں۔ بادشاہ کو اس پر کچھ تیزی آ گئی۔ اور کہنے لگا تعجب ہے آج آپ ان تبرکات کو مصنوعی بتاتے ہیں۔ مولانا نے نہایت متانت سے فرمایا۔ جناب والا آپ کا بھی یہی خیال ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ سال بھر میں دو دفعہ وہ تبرکات آپ کی زیارت کو آتے ہیں اور آپ ایک دفعہ بھی اُن کی زیارت کے لئے تشریف نہیں لے گئے اکبر شاہ چپ رہ گیا۔ اس کے بعد مولانا نے کسی سے کہا کہ قرآن شریف اور بخاری شریف لاؤ۔ چنانچہ یہ دونوں کتابیں لائی گئیں۔ آپ نے اُن کو ہاتھ میں لیکر واپس کر دیا۔ اور فرمایا یہ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن شریف کتاب اللہ ہے اور بخاری شریف کلام رسول جس کو امت نے قرآن پاک کے بعد تمام کتابوں میں صحیح تر تسلیم کیا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ ان دونوں کے احترام میں کوئی نہیں کھڑا ہوتا۔ اور یہ تبرکات جن کے متعلق کوئی سند نہیں کہ واقعی وہ تبرکات ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال۔ اور ایک رسم ہے۔ اُن کے متعلق یہ سب احترامات۔ مولینا نے اس موقعہ پر نہایت مفصل اور مدلل تقریر فرمائی۔ بادشاہ گردن جھکائے تقریر سن رہا تھا۔ آنسوؤں کی لڑی آنکھوں سے جاری تھی۔ بادشاہ سونے کے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اور اس کی برابر شاہزادہ بیٹھا ہوا تھا جس کی داڑھی منڈی ہوئی تھی حضرت

شہید نے ان دونوں منکرات پر بھی تنبیہ فرمائی۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ بادشاہ نے کڑے اتار دئے۔ اور شاہزادے نے اس کے بعد داڑھی نہیں منڈوائی[1]

حضرت شہید کے متعلق بہت سی حکایتیں ارواح ثلاثہ میں مستقل طور پر نقل کی گئی ہیں جن سے حضرت موصوف کے ایثار۔ خلوص۔ ذکاوت۔ ذہانت۔ جذبۂ ایمانی۔ احساس ملی۔ سادگی اور خدمت خلق کے مضطرب ولولہ۔ بہبودی ملت کے بے پایاں درد۔ کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے افسوس کہ خوف طوالت ان تمام واقعات کے نقل کرنے سے مانع ہے۔ ہم آخر میں صرف ایک دلچسپ واقعہ نقل کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

"اکبر شاہ بادشاہ دہلی کی بڑی بہن تھیں جن کو "بی چھکو" کہا کرتے تھے۔ چونکہ یہ بادشاہ سے بہت بڑی تھیں۔ اس لئے بادشاہ اور تمام شاہزادے شاہزادیاں ان کا ادب کرتے تھے۔ بی چھکو کو گالیاں اور کوسنے دینے کی بہت عادت تھی۔ ایک مرتبہ کچھ شہزادوں اور چند شیعوں نے مشورہ کیا کہ مولانا اسمعیل صاحب شہید رح کو بھی بھرے مجمع میں بی چھکو سے گالیاں دلوانی چاہئیں۔ چنانچہ ایک دعوت کی گئی۔ جس میں بی چھکو اور اُن کی ہجولیوں کو مدعو کیا گیا۔ اور حضرت مولانا اسمعیل صاحب شہید رح کو بھی دعوت دی گئی۔ اور آخری مقدور تک بی چھکو کو حضرت شہید کی طرف سے برہم کر دیا گیا۔

مختصر یہ کہ حضرت شہید جب جلسہ میں پہنچے تو "بی چھکو" نے بڑھ کے

---

[1] ارواح ثلاثہ صـ۱۵۹ و صـ۱۶۲

پیچھے سے غصہ کی آواز سے دریافت کیا کہ "کون ہے۔ کیا عبدالعزیز کا بھتیجا ہے اسمٰعیل"؟

حضرت شہید رح۔ آغا۔ یہ آواز تو چھکو اماں کی معلوم ہوتی ہے۔ اماں سلام۔

بی چھکو خواہ کتنی ہی بدزبان ہو۔ مگر ہندوستان کی بوڑھی خاتون تھیں۔ خاندان مغلیہ کی شاہزادی تھیں۔ جو رعایا کو اولاد کی برابر سمجھتے تھے۔ بی بی چھکو نے سلام سنا تو لگیں بڑی بوڑھیوں کی طرح دعائیں دینے اب کہاں کا غصہ اور کہاں کی برہمی۔ ادھر ادھر کی دو چار باتیں کر کے کہا کہ اسمٰعیل ہم نے سنا ہے کہ تم بی بی کی صحنک کو منع کرتے ہو۔

حضرت شہید۔ اماجی! بھلا میری کیا مجال کہ میں بی بی جی کی صحنک کو منع کروں۔

بی چھکو۔ لوگ کہتے ہیں۔ مولانا شہید۔ جو کہتا ہے غلط کہتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بی بی کے ابا جان منع کرتے ہیں۔ میں تو لوگوں کو بی بی کے ابا جان کا حکم سناتا ہوں۔

بی چھکو۔ حیرت کے لہجہ میں۔ کیا بی بی جی کے ابا منع کرتے ہیں؟

مولانا شہید۔ جی ہاں۔ چنانچہ بدعتوں کی قباحت کے متعلق چند احادیث پیش فرما دیں۔

بی بی چھکو نے جب احادیث اور ان کی تشریح سنی تو سر تسلیم خم کر لیا اور فرمانے لگیں۔ ہم بی بی پر ایمان نہیں لائے۔ ہم تو بی بی کے ابا پر ایمان لائے

ہیں۔ جب وہ ہی منع کرتے ہیں تو ہم پھر کیوں کریں۔ اب سے اگر کوئی عورت کرے گی تو اس حرامزادی کی ناک چٹیا کاٹ لوں گی (ارواح ثلاثہ صـ)

حملہ اور سازش قتل | شرک و بدعت کی وہ تاریک فضا (جس میں سیدنا حضرت شاہ محمد اسمٰعیل صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے مصلحانہ اقدام کیا تھا۔ اور جس میں اغراض نفسانی کے ہزاروں دیو۔ شہوات اور بوالہوسی کے ہزاروں اژدہا منہ پھیلائے رینگ رہے تھے) حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب کے لئے جس قدر خطرناک ہو۔ کم ہے۔

فدا حسین[1] نامی رسول شاہی فرقہ کا پیشوا تھا۔ حد سے زیادہ بددین۔ فرقہ رسول شاہی کے علاوہ خود ان قبر پرستوں اور نذر و نیاز پر بسر کرنے والوں کی حقیقت کھل رہی تھی۔ حضرت شہید کی اصلاح و تبلیغ انکی عیش پرست زندگی کے لئے فال بد تھی۔ قوالوں اور گویوں کی اصلاح طبقہ اوباش کو براہ راست مشتعل کر رہی تھی۔ ان تمام اقدامات کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کے قتل کے منصوبے ہونے لگے۔ بقول مولانا محمد یعقوب صاحب "ہم لوگ (قارردانان حضرت شہید) ان کی بہت حفاظت کیا کرتے تھے"[2]

اس موقعہ پر ارواح ثلاثہ کی حکایت ۲ کا نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سے حضرت شہید کی تبلیغی جد و جہد پر مجموعی حیثیت سے ایک روشنی پڑ جائے گی

---

[1] سید صاحب بانی علی گڈھ کالج کی نانی صاحبہ فدا حسین کی بہن تھیں۔ ارواح ثلاثہ صـ [2] ارواح ثلاثہ صـ

مولانا اسمٰعیل صاحب شہید کا قاعدہ تھا کہ جہاں کہیں کوئی میلہ ہوتا خواہ ہندؤں کا ہو یا مسلمانوں کا یا کوئی اور مجمع ہوتا۔ جیسے ناچ یا قوالی کی محفل۔ تو آپ وہاں پہنچتے اور وعظ فرماتے۔ جس کا اثر یہ ہوتا کہ ان محفلوں کے اکثر آدمی جگہ چھوڑ چھوڑ کر آپ کا وعظ سننے لگتے۔ آپ حضرت نظام الدین اولیاء میں بھی پہنچکر وعظ فرماتے۔ در وہاں بھی یہی اثر ہونے لگا تھا۔ جب مجاوروں نے یہ رنگ دیکھا تو ان کو سخت ناگوار ہوا۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ مولوی اسمٰعیل صاحب کو کسی طرح قتل کر دینا چاہیئے۔ ایک بڈھے نے آپ کے قتل کا بیڑا اٹھایا۔ ایک روز مولینا شہید جامع مسجد میں بیچ کے در میں وعظ فرما رہے تھے کہ اُس بڈھے نے مولانا پر تلوار کا وار کیا۔ مولانا تو بچ گئے وہ تلوار مولانا کے ایک دوست کے لگی اور ان کا شانہ زخمی ہو گیا۔ اس پر مولانا کے دوست اُس بڈھے کو لپٹ گئے۔ اور تھپڑ وغیرہ مارنے لگے۔ مولانا نے اُس بڈھے کو چھڑا دیا اور کوئی مقدمہ نہیں چلایا[۱]

مرزا حیرت، کا بیان ہے کہ حاجی قاسم صاحب، امام عیدگاہ دہلی کا مرزا دینا بیگ جو مخالف جماعت، کے سرغنہ تھے جب، دہلی کے آدمیوں ..... کے ذریعہ سے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ کر سکے، تو انہوں نے پنجاب سے کچھ نوجوان اس مقصد کے لئے بلائے۔ جن کو گرانقدر رقومات کا لالچ دیا گیا۔ جو خفیہ طور سے دہلی میں داخل ہوئے اور کچھ عرصہ اُن کو دہلی میں اس طرح چھپا کر رکھا گیا کہ اگر کہیں منتقل کرنا ہوتا تو ڈولیوں کے ذریعہ سے ان کو منتقل کیا جاتا۔ ایک روز جب کہ مولانا مسجد فتح پوری میں دو پہر

[۱] ارواح ثلاثہ صلے ۷۲

کے وقت فرش پر ٹہل رہے تھے۔ اُن میں سے دو جوان پہنچ گئے۔ جب وہ مسجد کے باہر جوتے اتار کر فرش پر دو چار قدم چلے اور فرش کی گرمی سے اُن کے قدم جلنے لگے تو ایک دم اُن کو احساس ہوا کہ یہ شخص کس پایہ کا انسان ہے۔ جو برہنہ پا اس فرش پر اطمینان سے ٹہل رہا ہے۔ فوراً اپنے ارادہ سے تائب ہو کر باادب حاضر خدمت ہوئے اور پھر مولانا کے رفیق اور جاں نثار خادم بن گئے۔

پنجاب کے جس جوشیلے مسلمان نے ان کو قتل کے لئے بھیجا تھا۔ وہ رنجیت سنگھ کے خادم خاص تھے۔ غلام رسول نام تھا۔ مگر جوش وفاداری میں اپنا نام "بندۂ رنجیت سنگھ" رکھ لیا تھا۔ قوم سے رنگریز تھا۔ اور غیرت ایمان کی انتہا یہ تھی کہ اپنی بیٹی رنجیت سنگھ کے محل میں بھیج رکھی تھی" فاعتبروا یا اولی الابصار"
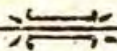
ایک سوال اور اُس کا جواب

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے بدعتوں کی تردید کیوں نہیں کی؟

یہ ایک عجیب اتفاق ہوا کہ حضرت شہید قدس اللہ سرہ العزیز کی سوانح عموماً غیر مقلد حضرات نے جمع کی۔ چونکہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب وغیرہ حضرات کی تقلید کا انکار نہیں ہو سکتا تھا تو دوسری سہل یہ تھی کہ ان حضرات کو "مداہن فی الدین" قرار دیا جائے۔ چنانچہ عام طور پر لکھا گیا اور کہا گیا کہ یہ حضرات اس قدر چشم پوشی کیا کرتے تھے کہ خود ان کے گھر میں رسومات قبیحہ کا رواج تھا

ہم نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے حالات لکھتے ہوئے اس الزام کا مفصل جواب دیا ہے۔ لیکن ہم یہاں ایک دوسری حقیقت کے چہرہ سے نقاب اٹھانا چاہتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ان اکابر میں سے کوئی بھی خلاف شرع چیز پر چشم پوشی کرنے والا نہ تھا۔ آج ہم ان حضرات کی تقریر نہیں سن سکتے۔ مگر انکی تحریرات ہمارے سامنے ہیں جو خیالات اور عقائد معلوم کرنیکے لئے سب سے بہتر وثیقہ ہیں۔

انسان خوف یا اللالچ کے موقعہ پر اظہار حق میں سستی کر سکتا ہے۔ لیکن ان حضرات کے پاکیزہ دامن ان دونوں چیزوں کی آلائش سے پاک تھے۔ جو شخص برسر اقتدار حکومت کے مقابلہ پر سینہ سپر ہو کر ہر قسم کی مصیبت کے لئے تیار رہ سکتا ہو اس پر عوام کی مخالفت سے خوف

یا موافقت کی طمع کا الزام در حقیقت بدترین جرم ہے۔

بلا شبہہ ان حضرات نے بھی پوری ہمت اور جرأت سے کام لیا۔ اصلاحِ قوم کے لئے پوری جدوجہد صرف کر دی مگر واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات کے زمانہ جدوجہد میں کوئی حکومت اس قسم کی نہ تھی جس کی پالیسی یہ ہو کہ "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو"

۱۸۰۳ء مطابق ۱۲۱۸ھ سے انگریزی ریزیڈنٹ دہلی میں رہنے لگا۔ انگریز نے ہندوستان کے تیس پینتیس کروڑ انسانوں پر حکومت کرنے کے لئے پہلے سے چار تدبیریں سوچی تھیں۔

(۱) "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو"

(۲) ایسی تعلیم دو جس سے ہندو اور مسلمان عیسائی نہ بن سکیں تو کم از کم اپنے مذہب سے متنفر ہو جائیں۔

(۳) یہ تمام کارروائیاں تہذیب اور تعلیم کے نام پر کی جائیں۔

(۴) چوتھی چیز وہ ہے جو انگریز کی فطرت میں سرشت ہوئی ہے۔ یعنی ضرورت کے موقعہ پر جھک جانا۔ اور جس کو تباہ و برباد کرنا مدنظر ہو۔ حسب ضرورت اس کی انتہائی تعظیم اور عزت کرنا۔[۱]

---

[۱] ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک بڑی قوت سے جاری تھی۔ کانگریس پامردی سے انگریز کا مقابلہ کر رہی تھی۔ یہی زمانہ تھا جب امریکہ نے قرضہ جنگ کا مطالبہ کر کے سارے یورپ کو سراسیمہ کر دیا تھا۔ برطانیہ کو اپنی ساکھ قائم رکھنے کے لئے ضروری ہو گیا کہ ہندوستان کی جانب سے دنیا کو اطمینان دلائے

انگریز نے دہلی پہنچ کر دیکھا کہ سیدنا شاہ ولی اللہ صاحب کا خاندان عام مقبولیت رکھتا ہے۔

اگر وہ توجہ کرے تو اس کی دعوت پر مسلمانوں کا منتشر شیرازہ گلدستہ بن سکتا ہے۔ اُس نے ایک طرف اپنی ڈپلومیسی کو کام میں لاتے ہوئے اس خاندان کی ظاہری تعظیم و تکریم میں عاجزی کے ساتھ سر جھکا دیا۔

ریزیڈنٹ سیدنا حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر وہی تعظیم بجا لاتا جو اپنے پوپ کی تعظیم کر سکتا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تو فوراً لارڈ ارون نے کانگرس کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا اور گاندھی جی اور اُن کے ساتھ تمام قیدیوں کو رہا کر دیا۔ پھر گاندھی جی کے ساتھ وہ محبت آمیز اور دوستانہ ملاقاتیں رہیں کہ لوگوں کے دلوں پر ارون کی محبت کا گہرا اثر ہو گیا۔ گاندھی جی راؤنڈ ٹیبل میں شرکت کے لئے ۱۹۳۱ء میں لندن گئے تو وہاں اُن کو دنیا کا سب سے بڑا آدمی کہہ کر نہایت شاندار استقبال کیا گیا۔ لیکن ابھی گاندھی جی لندن سے واپس نہ ہوئے تھے کہ لارڈ ولنگڈن کا دور شروع ہو گیا۔ اور وہی گاندھی جی جن کا یورپ میں پرتپاک خیر مقدم ہو رہا تھا اور جن کو دنیا کا سب سے بڑا آدمی کہا جا رہا تھا۔ ہندوستان پہنچے تو غیر معین مدت کے لئے جیل میں بند تھے۔ امان اللہ خاں شاہ افغانستان جب سیر کے لئے یورپ تشریف لے گئے۔ تو لندن میں اُن کی شاندار ضیافتیں ہو رہی تھیں اور افغانستان میں اُنکے اور اُنکی بیوی ملکہ ثریا کے متعلق قسم قسم کے فرضی فوٹو تقسیم کرا کر انقلاب پیدا کیا جا رہا تھا۔ احمد شاہ قاچار والی ایران اور ہندوستان کے بادشاہ بہادر

عام مسلمان اس دھوکے میں ضرور پڑ گئے کہ انگریز ہمارے علماء کی توقیر کرتے ہیں۔ مگر سیدنا شاہ عبدالعزیز صاحب اور آپ کے متوسلین ایسے بیوقوف نہ تھے۔ اُن کی ایمانی فراست نے انگریز کا تعارف پہلی ملاقات ہی میں کرا دیا تھا۔

چنانچہ یہی سیدنا شاہ عبدالعزیز ہیں کہ ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے ہیں۔ اب ایک طرف ان حضرات کی عام مقبولیت۔ دوسری جانب ان حضرات کی حریت پرور صداقت ان دونوں چیزوں کا مقابلہ کرنے کے لئے انگریز کے پاس کامیاب حربہ یہ تھا کہ

تفرقہ ڈالو۔ اور حکومت کرو

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب معذور تھے۔ اور چراغ سحری تھے۔ سیدنا شاہ اسمٰعیل صاحب بلند ہمت نوجوان اور حق پرست مجاہد میدان میں تھے۔ چنانچہ ان ہی کو زد پر رکھا گیا۔ اور خود پس پردہ رہ کر نام کے علماء کو کام کے علماء سے ٹکرا دیا۔

کیا آج ہمارے سامنے یہی نقشہ درپیش نہیں؟ ایک طرف حضرت مولانا حسین احمد صاحب حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب، ابوالمحاسن مولانا سجاد صاحب، مولانا ابوالکلام صاحب آزاد جیسے علم وفضل کے دریائے ناپیداکنار ہیں جنہوں نے اپنی پاک زندگیاں ملت اور ملک کی خدمت کے لئے وقف کر رکھی ہیں اور ہر سخت سے سخت موقعہ پر خطرات کے گرداب میں کود کر قید و بند ضبطی اور جرمانوں کی مصیبتیں برداشت کر رہے ہیں۔

انہیں حضرات کے رفقاء خاص حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی، اور حضرت مولانا محمد میاں صاحب منصور انصاری مدظلہ العالی ہیں جو پچیس سال سے جلاوطن ہیں۔

دوسری طرف یا تو ایسے عالم ہیں جو سیاسیات سے قطعاً نابلد۔ اپنے خودغرض حواریین کے پھندے میں پھنسے ہوئے۔ یا ایسے عالم نما حضرات ہیں جو آج سے پیشتر کبھی اسٹیج پر نہ آئے تھے۔ اور نہ آج تک اُن کو دنیا نے عالم دین اور خادم ملت کی حیثیت سے پہچانا تھا۔

مگر افسوس ملت پر قربان ہونے والے کافر بتائے جا رہے ہیں اور آرام طلب یا گوشہ نشیں بے خبر۔ مجاہد ملت اور ابوحنیفہ وقت قرار دئے جا رہے ہیں۔

بہرحال یہ تسلیم ہے کہ حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہید رح کی تبلیغی جد وجہد فساد زمانہ اور خرابی حالات کے مقتضا کے بموجب کچھ زیادہ سرگرم تھی مگر یقیناً وہ حضرت مجدد الف ثانی رح کے جانشیں خاندان میں نئی نہ خیال کی جاتی۔ اگر ہندوستان میں وہ فساد انگیز طاقت برسراقتدار نہ ہوتی۔ جسکی حکومت کا بنیادی اصول یہ تھا کہ "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو"

جب ہم دیکھتے ہیں کہ محضر ناموں اور انگریزی علماء اور فساد انگیز صوفیوں کی تمام شرانگیز جد وجہد کے باوجود صرف چالیس روز کے بعد ریزیڈنٹ کو زبان بندی کا حکم واپس لینا پڑا۔ تو یقین ہو جاتا ہے کہ مسلمانان ہند کی عام ذہنیت حضرت شہید رح کی اصلاحات کے ساتھ تھی۔

اور پھر ان حضرات کے دورے جو تمام ہندوستان میں ہوئے اور جو اعزاز تمام ہندوستان میں ان کے قافلہ کا کیا گیا (جس کا ذکر آئندہ آئے گا) وہ یقین دلاتا ہے کہ مسلمانانِ ہند کی جمہوریت اور اکثریت زندگی کی خواہاں تھی اور حیات کے لئے مضطرب تھی۔ اور جو کچھ الزامات ان حضرات پر لگائے گئے اور جس طرح ان حضرات کو بدنام کیا گیا۔ وہ انگریزی اقتدار کی برکت تھی۔ تاکہ مسلمانانِ ہند کی جاگنے والی روح ہمیشہ کے لئے گاڑھی نیند سلادی جائے۔ اور ان کی توجہ سیاسیات سے ہٹاکر خانہ جنگی میں الجھادی جائے۔

حضرت سید صاحب اور حضرت شہیدؒ کی مشترک خدمات

پہلے گزر چکا ہے کہ ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۸۱۶ء میں سیدنا حضرت سید احمد صاحب قدس اللہ سرہ۔ دوبارہ دہلی تشریف لائے اور اس مرتبہ سیدنا حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید اور حضرت مولانا عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہما۔ سید صاحب کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔ اور پھر رفتہ رفتہ آپ مرجع خلائق بننے لگے۔ اطراف و جوانب میں آپ کے فیوض اور کمالات کا چرچا پھیلنے لگا۔ اور دعوتی خطوط آنے لگے۔ تو اب سیدنا شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ العزیز نے اصلاح و تبلیغ کے دائرہ کو وسعت دی۔

ایک جماعت تعلیم و تدریس کے لئے دہلی میں مامور فرمائی گئی۔ سیدنا شاہ اسحٰق صاحب رح اور سیدنا شاہ یعقوب صاحب۔ مولانا رشید الدین خاں صاحب۔ مولانا مفتی صدر الدین صاحب اس جماعت کے مقتدر ارکان ہیں۔

دوسری جماعت اطراف دہلی میں تبلیغ وارشاد کے لئے روانہ کی گئی۔
یہ وہ زمانہ تھا کہ شیعوں کا اقتدار ختم ہو رہا تھا۔ انگریزی اقتدار روزافزوں تھا اور کامل ایک صدی بلکہ ایک سو ۱۲ سال کی شیعہ گردی اور پھر جاہل صوفیوں کی زندیقانہ مکاریوں نے شجرہ توحید کو اس درجہ پژمردہ کردیا تھا کہ اگر یہ جماعت نہ ہوتی تو آج ہندوستان میں صحیح العقیدہ مسلمان کا نام ونشان بھی موجود نہ ہوتا
ممکن ہے ان الفاظ کو مبالغہ قرار دیا جائے لیکن آپ جب گہرے مطالعہ کے بعد معلوم کریں گے کہ موجودہ زمانہ کے تمام سربرآوردہ اہل علم اور مشہور علمی اداروں کا تعلق ان ہی بزرگوں سے ہے تو آپ کو مندرجہ بالا بیان کی تصدیق میں کوئی شک وشبہہ باقی نہ رہے گا۔
الحاصل حضرت سید صاحب۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید اور مولانا عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہما کو لیکر دہلی سے روانہ ہوئے۔ اور مظفرنگر۔ سہارنپور۔ رامپور۔ بریلی۔ شاہجہانپور وغیرہ کا دورہ فرمایا۔ اثناء دورہ میں بہت سے مباحثے بھی ہوئے۔ کرامتوں کا ظہور بھی ہوا۔ چند مرتبہ مخالفین کی جانب سے حضرت سید صاحب کے قتل کی سازش بھی کی گئی مگر ان تمام کی تفصیلات طوالت طلب ہیں۔ سوانح احمدی وغیرہ میں انکا مطالعہ فرمایا جائے۔

سکھوں کے مظالم کی اطلاع | جب آپ اسی دورہ کے اثنا میں رامپور تشریف فرما تھے تو چند افغانوں کی زبانی جو پنجاب سے گزر کر رامپور پہنچے تھے معلوم ہوا کہ پنجاب میں مسلمانوں پر یہاں تک ظلم ڈھایا جا رہا ہے کہ مسلمان

عورتوں کو زبردستی پکڑ کر گھر میں ڈال لیا جاتا ہے۔ اذانوں پر بھی بندش عائد کی جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اُن ہی ایام میں آپ کے برادر اسحاق صاحب کی وفات کی خبر آپ کو موصول ہوئی۔ آپ اپنی جماعت کے ساتھ وطن مالوف رائے بریلی کو روانہ ہو گئے اس وقت آپ کے رفقاء کی تعداد سو کے قریب تھی۔ اور یہی زمانہ تھا کہ جس کو ساٹھے کے قحط سے ایک عرصہ تک یاد کیا گیا۔ اس باخدا جماعت کا مدار توکل پر تھا[1]

نکاح بیوگان کا آغاز ہندوستان میں آج بھی اُن کی کمی نہیں جو نکاح بیوگان کو معیوب سمجھتے ہیں۔ حالانکہ لطیفہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سیدنا عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ سب بیوہ تھیں بہرحال حضرت سید صاحب کا زمانہ وہ تھا جس میں نکاح بیوگان کو کفر سے بھی زیادہ معیوب سمجھا جاتا تھا۔

بیوہ بھاوج کی عدت ختم ہوئی تو اس مصلح اعظم کو خیال پیدا ہوا کہ جس پیغام کو دوسروں تک پہنچانا ہے اس پر اولاً خود عامل ہونا چاہیے۔ چنانچہ سلسلہ جنبانی ہوئی۔

اگرچہ بہت کچھ رد وکد ہوئی۔ مگر تاہم محترمہ بھاوج صاحبہ کی سعادت تھی کہ وہ نکاح پر آمادہ ہوگئیں۔ گویا صدیوں کے بعد یہ پہلا نکاح تھا۔ جس کے ذریعہ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مردہ سنت کو زندہ کیا گیا۔

---

[1] ایک مبلغ کیساتھ یہ جمعیت قابل غور ہے [2] سوانح احمدی ص۲۶ و ۲۷ ملخصاً

اس کے بعد دوسرا نکاح وہ تھا جو حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہید رح کی عمر رسیدہ ہمشیرہ کا مولانا عبدالحیٔ صاحب سے ہوا[۱]

نصیر آباد میں شیعہ سنی فساد نصیر آباد رائے بریلی کے قریب ایک قصبہ ہے۔ یہاں شیعہ بھی رہتے ہیں۔ حضرت سید صاحب کے آبا و اجداد کا قدیمی مسکن یہی قصبہ ہے۔ اس زمانہ میں نوابان لکھنؤ کا کچھ اقتدار باقی رہ گیا تھا۔ مولوی دلدار علی صاحب لکھنؤ کے درباری مجتہد تھے۔ وہ حضرت سید صاحب کے وقار سے بہت خار کھاتے رہتے تھے۔ انہیں کے ایما سے نصیر آباد کے شیعوں نے تمرد اختیار کیا تھا۔ مجتہد صاحب کا خیال یہ تھا کہ اس طرح سید صاحب سنیوں کی حمایت کریں گے تو دربار لکھنؤ سے اُن کی گوشمالی کا ایک موقعہ ہاتھ لگ جائے گا۔

چنانچہ سید صاحب خبر پاتے ہی اپنی جمعیت لیکر نصیر آباد پہنچے۔ جس سے شیعوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ اور پھر سید صاحب نے معاملہ کو اس طرح رفع دفع کیا کہ نواب لکھنؤ "نواب معتمد الدولہ" کے دل میں آپ کی عزت پیدا ہو گئی۔ اُس نے لکھنؤ آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ یہ جماعت لکھنؤ گئی اور خوب خوب وعظ و پند کی مجلسیں گرم ہوئیں اس وقت آپ کی رفاقت میں ایک سو ستر حضرات تھے۔ شاہ پیر محمد عرف پیرن شاہ کے ٹیلے پر آپ کا ڈیرہ

---

[۱] سوانح احمدی، ارواح ثلاثہ میں مولانا اسمٰعیل صاحب کی ہمشیرہ کے نکاح کا قصہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ آپ قصبہ پھلت میں تقریر فرما رہے تھے۔ آپ نے نکاح ثانی کی ترغیب فرمائی۔ ایک شخص کھڑا ہوا۔ اور کہا کہ مولانا کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں (باقی اگلے صفحہ پر)

رہا۔ تین چار ہفتہ قیام رہا۔ اور پھر روانگی کے وقت نواب معتمد الدولہ نے مبلغ پانچہزار روپیہ کی نذر پیش خدمت کی۔

لکھنؤ سے فارغ ہو کر حضرت سید صاحب بریلی تشریف لے گئے ۵ا۔

تبلیغی سفر | کچھ عرصہ بریلی قیام فرما کر آپ باشندگان الہ آباد کی دعوت پر الہ آباد کے لئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں وعظ و ارشاد کا سلسلہ جاری ہوا۔ حتیٰ کہ الہ آباد سے بنارس تک کا راستہ جو چار منزل سے زائد نہیں سوا ماہ میں

(بقیہ صفحہ گذشتہ) مولانا شہید فوراً منبر سے اترے۔ دہلی آئے اور اپنی بہن کے قدموں میں عمامہ رکھدیا اور عرض کیا کہ بہن اگر تم چاہو تو میں وعظ کہہ سکتا ہوں ورنہ نہیں۔ بہن نے دریافت کیا کہ کیا بات ہے۔ آپ نے فرمایا نکاح کر لو۔ ہمشیرہ صاحبہ نے جواب دیا کہ مجھے شریعت کی اتباع سے انکار نہیں مگر میں نکاح کے قابل نہیں ہیں۔ سن رسیدہ ہوں اور دمہ کے عارضہ میں مبتلا ہوں۔ کمزور ہوں۔ فرمایا لوگ نہیں مانتے۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ آپ رسم کی وجہ سے نکاح نہیں کرتیں۔ ہمشیرہ صاحبہ اس خیال کی تغلیط کے لئے نکاح پر آمادہ ہوگئیں ۱۲ ارواح ثلاثہ ص۶۸ ۵۲ چونکہ حلقہ ارادہ کی وسعت روز افزوں تھی۔ مہمانوں کی آمد روز بروز بڑھ رہی تھی تو آپ نے ایک مکان کی تعمیر کا قصد کیا۔ مگر روپیہ کا نام نہ تھا تو آپنے اپنے ساتھیوں کیساتھ اول اینٹیں پاتھیں اور پھر مکان تعمیر کیا جس میں اہل خانہ کو منتقل کر کے پرانے مکان کو مہمان خانہ بنادیا۔ ان ہی ایام میں اپنے احباب کے ساتھ ملکر دو مسجدیں تعمیر کرائیں ایک شاہ علم اللہ صاحب کے تکیہ کے پاس اور دوسری مسجد رائے بریلی شہر کے وسط میں دو ماہ تعمیر مکان میں صرف ہوئے اور تین ماہ تعمیر مساجد میں۔ مکان اور مسجد کی تعمیر میں حضرت سید صاحب (باقی اگلے صفحہ پر)

طے فرمایا۔

الہ آباد سے آپ بنارس تشریف لے گئے یہاں آپ نے تقریبًا ایک ماہ قیام فرمایا۔ ہزاروں بندگان خدا حلقہ ارادت میں داخل ہوئے جن میں سب سے زیادہ مستحق تذکرہ "حیات النساء بیگم" ہے۔ جو ایک انگریز کی داشتہ" مدخولہ" تھی جس نے بیعت کے بعد تمام عیش و آرام پر لات مار کر قافلہ کی خدمت اپنے ذمہ لی۔

ایک روز جب کہ وہ گھوڑوں کا دانہ دل رہی تھی۔ کسی نے پوچھا وہ زندگی اچھی تھی یا یہ اچھی ہے؟" حیات النساء بیگم نے جواب دیا کہ

"اس زندگی کی ساری عمر اس زندگی کے ایک لمحہ پر قربان وہ دنیا تھی جس کی حقیقت خدا کی نگاہ میں مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں۔ یہ زندگی وہ ہے جس کی ایک صبح کو حدیث نبوی میں دنیا اور تمام دولت دنیا سے بہتر بتایا گیا ہے۔"

قیام بنارس کے زمانہ میں سلطان ٹیپو کے چند پس ماندگان خدمت مبارک میں حاضر ہو کر بیعت سے مشرف ہوئے۔ دودمان سلطانی کے ان معتقدین نے بیش قیمت تھان اور جوڑے خدمت میں پیش کئے۔ سید صاحب نے اُن کپڑوں کو مولوی محمد یوسف صاحب داروغہ کے حوالہ کر کے فرمایا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دیگر رفقاء کے ساتھ شریک رہتے تھے اور پھر سنت سید المرسلین کے کامل احترام کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سید صاحب نے ایک مسجد شہر کے باہر بنا کر مسجد قبا کی تعمیر کی سنت کا اتباع کیا اور دوسری مسجد شہر میں بنا کر مسجد نبوی کی تعمیر کی سنت پر عمل کیا۔ فرحمہ اللہ ۱۲

کہ ان کو فروخت کر کے حاجتمند رفقاء اور احباب کے لئے جڑاول تیار کرا لو۔

شیخ غلام علی صاحب الہ آبادی نے ایک عمدہ قالین پیش کیا۔ آپ نے شیخ صاحب موصوف کی دلداری کے لئے چند روز استعمال فرما کر ایک حاجتمند رفیق کو دیدیا۔ جس نے فروخت کر کے لحاف و رضائی وغیرہ جڑاول بنالی۔

بریلی کو واپسی بنارس سے فارغ ہو کر آپ سلطان پور تشریف لائے جہاں غلام حسین خاں فوجدار ریاست لکھنو اپنی فوج کے ساتھ قیام کیے ہوئے تھا۔ اس کی فوج کے بہت سے سپاہی سید صاحب سے بیعت تھے۔ دو ہفتہ آپ نے وہاں قیام فرمایا پھر وطن مالوف "رائے بریلی" تشریف لے آئے۔ کچھ دنوں آپ نے وطن میں قیام فرما کر ساکنان کانپور۔ کوڑہ جہان آباد۔ کھجوہ۔ فتح پور۔ دلمئو وغیرہ کی درخواست کے بموجب ان مقامات کا دورہ فرمایا۔ سیکڑوں ہزاروں مسلمان حلقہ بگوش عقیدت ہوئے۔ کانپور میں سید محمد یٰسین صاحب کے مکان پر کچھ دنوں قیام فرمایا۔ دوران قیام میں منڈوڈ صاحب فرنگی کی بیم مشرف باسلام ہوئی۔ اور ایک ہفتہ سید صاحب کو مہمان رکھا۔ مس موصوف نے اپنی ایک کوٹھی مع سامان آرائش حضرت کی نذر میں پیش کی۔ سید صاحب نے اُس کو قبول فرما کر وقف کر دیا اور مس موصوف کو اُس کا متولی بنا دیا۔ اور ہدایت کر دی کہ مسافروں اور بالخصوص سلسلہ مبارکہ کے منسلکین کی خدمت کرتی رہیں (سوانح احمدی صـ۲۶)

کانپور سے روانہ ہو کر کوڑہ جہان آباد پہنچے۔ پھر مجھاون پہنچکر قاضی کی مسجد میں قیام فرمایا۔

سفرِ حج اور عزمِ جہاد | سوانح نگاروں کی تحریر کے بموجب سکھوں کے مظالم کی اطلاعیں حضرت سید صاحب تک پہنچ رہی تھیں اور ہمارے خیال کے بموجب جہادِ حریت کی روح مسلمانوں میں بقدرِ ضرورت پھونکی جا چکی تھی اب جہاد کے لئے روانگی کا قصد ہے۔ مگر جہاد سے پیشتر حج بیت اللہ کی شرف اندوزی ضروری سمجھی گئی۔

اس وقت ۱۲۳۶ھ کا دور ہے۔ آپ بریلی میں قیام فرما ہیں۔ آجکل مولانا اسمٰعیل صاحب شہید اور مولانا عبدالحی صاحب اپنے وطن مالوف دہلی میں قیام پذیر ہیں۔ البتہ دیگر رفقاء سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہیں۔ سید صاحب۔ حج بیت اللہ کا ارادہ فرماتے ہیں۔ احباب و رفقا کو ارادہ کی خبر ہوتی ہے تو وہ بھی سفر حجاز کے لئے کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ جن جن مقامات کا دورہ ہو چکا تھا۔ وہاں سے متوسلین کی درخواستیں شرکت قافلہ کے لئے آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اطراف دہلی کے باشندگان کی درخواستیں حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہید اور حضرت مولانا عبدالحی صاحب کے پاس پہنچ رہی ہیں۔

شائقین حج اور جہاد اپنے اپنے مقامات پر اپنی جائدادیں فروخت کر کے سامان فراہم کر رہے ہیں۔

المختصر سفر کانپور سے واپس آکر تقریباً ایک ماہ بریلی میں قیام کیا۔ اس دوران میں تقریباً ڈھائی سو مرد اور عورت اطراف دہلی سے اور تقریباً سو آدمی اطراف بریلی سے پہنچ گئے ہیں۔ تقریباً چالیس آدمی خود سید صاحب کے خاندان کے ہیں۔

روانگی اور بے سروسامانی | چند گھنٹے پیشتر ۱۲۳۶ھ کا شہر مبارک رمضان شریف" رخصت ہو چکا ہے۔ عیدالفطر کی نماز سے فراغت ہو چکی ہے۔ سید صاحب اور آپ کے رفقا رخت سفر باندھ چکے ہیں۔ وطن عزیز کے احباب و اقارب ملاقات کے لئے آرہے ہیں۔ کیونکہ وطن کا پاکباز نونہال وطن سے رخصت ہو رہا ہے تاکہ اول رب ذوالجلال کے دربار میں حاضر ہو کر فلاح و بہبودی وطن کے لئے دعا کرے اور پھر استخلاص وطن کے لئے تخت یا تختہ کی بازی لگا کر آخری جدوجہد صرف کردے۔

خانوادہ سادات کا یہ ارجمند چشم و چراغ بھی رخصتی ملاقات کے وقت شان سرداری دکھانا چاہتا ہے۔ مگر افسوس کہ تہی دست ہے۔ بہر حال وطن کے غربا اور مساکین جو سامنے آرہے ہیں اُن پر نوازش فرما رہا ہے۔ بقول مصنف سوانح احمدی اس روز کُل ایک سو روپیہ اس بے تاج بادشاہ کے خزانہ میں جمع تھا۔ اور بقدر ایک میل سفر طے کرکے جب سید صاحب نے اپنے خزانچی مولوی محمد یوسف صاحب سے دریافت کیا تو صرف چھ یا ساتھ روپیہ باقی تھے۔ درانحالیکہ رفقا سفر کی تعداد تقریباً چار سو تھی۔ ان میں بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ اور ان تمام کے خورد و نوش کا تکفل حضرت موصوف فرمائے ہوئے تھے۔

بہر حال جب سید صاحب کو معلوم ہوا کہ کل چھ روپیہ موجود ہیں تو آپ نے فرمایا کہ اس رقم میں تو ایک وقت کا کھانا بھی نہیں مہیا ہو سکتا۔ لہذا ان کو بھی فقرا بریلی کو دیدو۔

سید صاحب کے کمال توکل۔ اور اعتماد کا اثر تھا کہ خدا کارساز ہر موقعہ

پر ضرورت پوری کرتا رہا۔ چنانچہ اگلے روز یہ قافلہ کوچ کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ قصبۂ دلمئو کے دو شخص حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا کہ ہم دونوں بھائی ہیں۔ حضور والا کے قافلہ کی خبر سُنکر ہم دونوں نے دعوت کا ارادہ کیا۔ مگر اس پر بحث ہے کہ پہلے کون شخص دعوت کرے۔ اس کے فیصلہ کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔

سید صاحب نے ارشاد نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کبرا لکبو کے پیش نظر بڑے بھائی کی دعوت آج کے لئے منظور فرمائی۔

اس قصبہ میں ایک ہفتہ قیام رہا۔ وعظ و مذاکرہ ہوتا رہا۔ اہل قصبہ دعوتوں پر دعوتیں کرتے رہے طے یہ تھا کہ کلکتہ تک دریا گنگ کی راہ کشتیوں میں سفر کیا جائے۔ چنانچہ نویں روز سفر دریا کے لئے پانسو روپیہ پر کشتیاں کرایہ کی گئیں۔ اہل قصبہ نے بلا طلب ضروری رقومات کا قصبہ سے انتظام کر کے خدمت میں پیش کر دیں

اب کشتیوں پر سوار ہو کر دریا گنگ کا سفر شروع ہوا۔ پانچ چھ کوس پر موضع دہمدمہ میں شیخ مظہر علی صاحب نے پھر موضع "ڈگڈگی میں شیخ محمد پناہ اور اُن کے فرزند شیخ محمد کفاہ" نے قافلہ کی دعوت کی۔ تین روز "ڈگڈگی" میں قافلہ کا قیام رہا۔ سیکڑوں آدمی اطراف وجوانب سے آکر بیعت سے مشرف ہوئے۔

"ڈگڈگی" میں جگہ جگہ تعزیوں کے لئے امام حسین رضؓ کے نام کے چبوترے بنے ہوئے تھے۔ حضرت سید صاحب نے سمجھا بجھاکر اُن کو توڑنے کا حکم دیا۔

چنانچہ اہل بستی نے ایک رات میں سارے چبوترے صاف کر دئے اور چاندی کا پنجہ اور ہلال وغیرہ جو کچھ سازوسامان تھا گلوا کر تقریباً دو سو روپئے مصارف قافلہ کے لئے خدمت میں پیش کر دے۔

براہ گنگا۔ سفر ہو رہا ہے۔ گنگا کے کنارے پر جو بستیاں ہیں وہاں کے سربرآوردہ حضرات خبر پاتے ہی دعوت کا سامان یا کشتیوں پر پہنچا رہے ہیں۔ اور یا قافلہ کو اپنے ہاں ٹھہرا کر دعوتیں کر رہے ہیں۔ آج تیسرا چوتھا روز ہے۔ بروایتِ سوانح احمدی ابرو باد کے باعث پریشانی ہے۔ کھانا پکانے کا سامان مشکل ہے۔ قافلہ والوں نے فاقہ کا ارادہ کر لیا ہے مگر غیب سے ایک سامان ہوتا ہے۔ کچھ مشعلیں دور سے گنگا کے کنارے پر نظر آتی ہیں۔ کشتیاں قریب پہنچیں تو معلوم ہوا کہ ایک انگریز جو نیل کا سوداگر تھا۔ کھانا لئے ہوئے حاضر ہے۔ اس کا کارخانہ لب گنگا تھا۔ سید صاحب نے اُس کا کھانا منظور کر لیا۔

مصنف سوانح احمدی نے اس کو انگریز کے حسن اعتقاد پر محمول کیا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس تاجر قوم کو حسن عقیدت سے کیا تعلق۔ درحقیقت اس نے خیال کیا ہوگا کہ مسلمانوں کو مانوس کرنے اور اپنی تجارت کی تشہیر کے لئے بہتر موقعہ ہے۔ ایک وقت کا کھانا پکوا کر پیش کر دیا۔ اور ظاہری طور پر عقیدتمندی اور فردتنی کا اظہار کر کے مسلمانوں کو اپنا معتقد بنا لیا۔ اور کیا عجب ہے کہ اس حاضری میں حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عزم و ارادہ کا بھی کچھ جائزہ لے لیا ہو

حضرت سید صاحب رح کی پالیسی یہی تھی کہ وہ انگریزوں سے مصالحت کا اظہار کر رہے تھے۔ کھانا منظور فرما لیا۔ اگرچہ فی الواقع سید صاحبؒ نے مال غنیمت سمجھا ہوگا۔

بہر حال کشتیاں آگے روانہ ہوئیں۔ آفتاب نمودار ہوا تو موضع رانخوڑہ کے گھاٹ پر ایک مرید خاص "شیخ حسن علیؒ" صاحب پہلے سے منتظر کھڑے تھے کشتیوں نے لنگر ڈالا۔ اور قافلہ نے تین روز اس موضع میں قیام کیا۔ چوتھے روز قافلہ روانہ ہوا۔ شیخ حسن علی صاحب بھی مع اہل وعیال قافلہ کے ہمراہ ہولئے۔ اس روز موضع دجھینی کے ایک زمیندار نے قافلہ کی دعوت کی۔

الہ آباد ایک روز کے سفر کے بعد کشتیاں الہ آباد پہنچ گئیں۔ بردا گھاٹ پر کشتیوں نے لنگر ڈالا۔ اس وقت قافلہ کی تعداد سات سو تک پہنچ گئی تھی۔ یہاں شیخ غلام علی صاحب نے پہلے سے قافلہ کو پندرہ روز ٹھہرانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ راجہ صاحب اودت نرائن کی بارہ دری لب دریا تھی۔ اسی بارہ دری میں قافلہ کا قیام رہا۔ دعوتوں میں الہ آباد کے معززارکان کو بھی شامل کیا جاتا تھا۔ اور بہت سے فقراء اور مساکین بھی لنگر سے کھانا پاکر شکم سیر ہوتے تھے۔ کھانے پرتکلف ہوتے تھے۔ اور ایک ہزار روپیہ یومیہ دعوتوں کا خرچ تھا۔ پندرہ روز ختم ہونے پر الہ آباد کے دوسرے باہمت حضرات نے حقوق میزبانی ادا کئے۔ بہر حال تقریباً تین ہفتہ الہ آباد میں قیام رہا سیکڑوں ہزاروں نفوس بیعت سے مشرف ہوئے

روانگی کے وقت شیخ غلام علی صاحب نے ۱۲ خیمے بنواکر قافلہ کے لئے پیش کئے۔

غرض اس صورت سے شیخ غلام علی صاحب نے تقریباً پچیس ہزار روپیہ خرچ کر دیا۔

دائرۂ شاہ اجمل کے مشائخ میں سے بعض حضرات آپ کی بیعت سے مشرف ہوئے۔

مرزاپور الہ آباد سے رخصت ہوکر مرزپور کے سامنے کشتیوں نے لنگر ڈالا۔ یہاں شیخ عبد اللطیف صاحب سوداگر نے ایک ہفتہ تک سارے قافلے کی مہمانی بڑی دھوم سے کی۔ چار ہزار روپیہ نقد بوقت رخصت پیش خدمت کیے۔ اور خود بھی شریک قافلہ ہوگئے۔ یہاں بھی ایک مخلوق کثیر بیعت سے مشرف ہوئی۔

چنارگڑھ مرزاپور کے بعد چنارگڑھ قیام رہا۔

بنارس بنارس میں حیات النساء بیگم۔ اور خاندان مغلیہ کے کچھ شاہزادے قافلہ کے منتظر تھے۔ یہاں پیشتر سے حضرت کے مریدان خاص کثرت سے موجود تھے۔

علاوہ ازیں موسم برسات کی شدت کے باعث دریا کا سفر بھی دشوار تھا۔ اس لیے ایک ماہ قیام کا قصد کیا۔ نماز عید اضحیٰ بھی یہیں ادا کی گئی۔ اہل شہر دونوں وقت بڑی شان کے ساتھ قافلہ کی دعوت کرتے رہے۔

غازی پور۔ زمانیہ بنارس سے روانہ ہوکر کشتیاں ایک دو روز کے لئے غازی پور اور زمانیہ میں لنگر انداز ہوتی ہوئی داناپور پہنچیں۔

داناپور داناپور میں ایک ہفتہ قیام رہا۔ جگہ جگہ وعظ ہوئے۔ حضرت شہید اور مولانا عبد الحی صاحب کی تقریروں نے ہزاروں قلوب کی تاریکی میں ایمان کی مشعل روشن کردی۔

پٹنہ عظیم آباد دانا پور سے سفر کر کے کشتیاں پٹنہ کے سامنے لنگر انداز ہوئیں۔ تقریبا دو ہفتہ یہاں قیام رہا۔ جا بجا وعظ اور جلسے ہوتے رہے۔ باشندگان عظیم آباد نے فراخ حوصلگی سے حقوق میزبانی ادا کیے۔ صادقپور کے باشندے خاص طور پر خدمت گزاری اور عقید تمندی میں پیش پیش تھے۔ ان کا نوابانِ بنگالہ کے خاندان سے تعلق تھا۔ حضرت سید صاحب کے مشہور خلیفہ مولانا ولایت علی صاحب اسی محلہ کے باشندے تھے۔

مونگیر۔ بھاگلپور پٹنہ سے کشتیاں روانہ ہوئیں۔ تو مونگیر۔ بھاگلپور میں مختصر قیام کرتے ہوئے مرشد آباد میں نزول اجلال ہوا۔ چار روز یہاں قیام رہا۔ مگر یہاں شیعوں کا غلبہ تھا۔ اس لئے کوئی کامیابی نہیں ہوئی مرشد آباد سے ہگلی تشریف لے گئے جہاں ایک ہفتہ قیام رہا۔ پھر بمقام "شی پور" قیام فرمایا۔ جہاں سید صاحب کے خلیفہ سید عبد اللہ صاحب ابن سید بہادر علی صاحب پہلے سے منتظر تھے۔ یہاں بہت سے آدمی بیعت سے مشرف ہوئے۔

کلکتہ شی پور سے روانہ ہو کر کشتیاں ساحل سمندر پر لنگر انداز ہوئیں قافلہ سرزمین کلکتہ میں فروکش ہوا۔ دوپہر کے کھانے کا انتظام منشی امین الدین صاحب کلکتہ کے معزز عمائدین میں سے تھے۔ حکومت کی جانب سے وکیل سرکار تھے۔ جو اس زمانہ میں بلند پایہ منصب تھا۔ منشی صاحب موصوف اپنے دیگر احباب کے ساتھ حاضر خدمت ہوئے۔ اور درخواست کی کہ تا قیام کلکتہ دو وقتہ طعام اور غریب خانہ پر قیام منظور فرمایا جائے۔

سید صاحب نے اس کو منظور فرمالیا۔ اس کے بعد دوسرے رؤساء اور عمائدین حاضر ہوئے اور دعوت کے متعلق درخواست کی۔ مگر حضرت سید صاحب نے معذرت فرمادی۔

الغرض سید صاحب کو خاص پالکی پر اور دیگر رفقاء اور اہل قافلہ کو مختلف قسم کی پرتکلف سواریوں پر سوار کراکر منشی صاحب اپنے مکان پر لے گئے۔ عالیشان مکان اور باغیچہ قیام کے لئے خالی دیا گیا۔

اہل قافلہ کے جوتے ٹوٹ گئے تھے ہر ایک کی خدمت میں ایک ایک جوڑی جوتی۔ اور جن کے لئے کپڑوں کی ضرورت محسوس کی اُن کے لئے کپڑے بنا کر پیش کر دئے۔

عشق و محبت کی عجیب داستان منشی امین الدین صاحب کے کارندے قافلے کی ہر قسم کی مدارات میں ہمہ تن مصروف رہے۔ شایان شان مہمان نوازی رہی۔ اسی صورت سے تقریباً ایک ماہ گزر گیا۔

سید صاحب بھی زائرین اور معتقدین کی کثرت کے باعث اتنی فرصت نہ پاسکے کہ منشی امین الدین صاحب کے بنگلہ پر جاکر ملاقات کریں۔ مولوی وحید الدین صاحب¹ جو حضرت سید صاحب کے رفقاء میں سے تھے ایک روز منشی امین الدین صاحب سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے

---

¹ قصبہ پھلت کے باشندے تھے۔ مولانا اسمٰعیل صاحب کے شاگرد رشید تھے۔ والد صاحب کا نام معین الدین تھا۔ جو اس قافلہ میں شامل تھے اور اسی سفر میں فراغت حج کے بعد مکہ معظمہ میں وفات پائی سوانح احمدی ص۹۲

منشی صاحب کے کمرہ کو دیکھا کہ نقرئی اور طلائی ظروف سے مزین ہے۔ جا بجا تصویریں آویزاں ہیں۔ عیش وطرب اور بادہ خواری کا تمام ہی سامان جا بجا سجا ہوا ہے۔

مولانا وحید الدین صاحب یہ رنگا رنگی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس کے بعد تحقیق سے معلوم ہوا کہ منشی صاحب ایک بازاری حسینہ کے دام عشق میں گرفتار ہیں۔ ہفتہ میں صرف ایک روز لذت وصال سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ اور باقی ۶ روز وصال یار کی آرزو میں بسمل مضطرب بنے رہتے ہیں

مولانا وحید الدین صاحب کے لئے یہ گندہ داستان جسقدر بھی قلق کا سبب ہوتی کم تھی۔

مولانا موصوف نے منشی امین الدین صاحب کو سمجھایا۔ اور حضرت سید صاحب کی خدمت میں غیر حاضری کا سبب دریافت کیا۔ منشی امین الدین صاحب اس وعظ و پند سے بہت زیادہ متأثر ہوئے۔ مگر اس گرفتار بلا کا عذر یہ تھا کہ اگر سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں تو لامحالہ توبہ کرنی پڑے گی۔ عشق کی لذت اور ہجر و وصل کی اس رنگا رنگی سے محروم ہونا پڑے گا۔ جس پر میں قادر نہیں۔

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
ناصحا ہم نہیں ہوں گے جو یہ درماں ہوگا

مولانا وحید الدین صاحب نے یہ تمام ماجرا حضرت سید صاحب سے آکر عرض کیا۔ سید صاحب نے فرمایا: "اُن سے کہدو کہ اگر سچے دل سے توبہ

کریں گے تو خداوند عالم استقامت بخشیگا۔ اور اضطراب بھی دور ہو جائیگا۔

ایک دو روز بعد مولانا وحیدالدین صاحب پھر تشریف لے گئے۔ وہ دن وصال محبوب کا تھا۔ مولانا وحیدالدین صاحب نے کچھ گفتگو شروع کی۔ وہ عورت سامنے موجود تھی۔ کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ حضرت سید صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ سید صاحب کو دیکھتے ہی حسینہ چلمن میں چھپ گئی۔ اب سید صاحب نے ایسی آواز سے وعظ و تذکرہ کا سلسلہ شروع کیا کہ پس چلمن آواز پہنچ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے وعظ نے لذت عیش اور غرور حسن کو کافور کر دیا۔ عشوہ و ناز کی امنگیں خوف و خشیہ کی دل سوزیوں سے بدل گئیں۔ حسن و انداز کی دیوی پیکر زہد و عصمت بنکر گریہ و زاری کرتی ہوئی سید صاحب کے قدموں پر آ پڑی۔ اپنے افعال سے توبہ کی۔ سید صاحب نے اس کا نکاح منشی امین الدین صاحب سے کر دیا۔ اور اس طرح خدا نے ان دونوں کو اپنے پاک بندوں میں داخل فرما لیا۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ کوئی صاحب جام سبو کے ایسے دلدادہ تھے کہ جب اُن سے سید صاحب نے توبہ کے لئے کہا تو عرض کیا کہ حضرت سب کچھ کر سکتا ہوں مگر شراب نہیں چھوٹ سکتی۔

سید صاحب نے فرمایا کہ اچھا ایک عہد کر لو کہ ہمارے سامنے نہ پیا کرو گے۔ اس نے اس عہد کو نہایت معمولی سمجھ کر اقرار کر لیا۔ مگر اس کے بعد جب بھی اُس نے شراب پینے کا ارادہ کیا تو دیکھا کہ سید صاحب موجود ہیں۔ آخر کار مجبور ہو کر اس نے توبہ کی اور اس بدترین علت سے نجات پائی۔

کلکتہ میں سید صاحب کے تبلیغی مشاغل

سوانح نگار لکھتے ہیں۔

قیام کلکتہ کے زمانہ میں دور دور سے مشتاقانِ زیارت آکر روزانہ بیعت کرتے تھے۔ اگرچہ رفقاء سفر کی تعداد زائد سے زائد آٹھ سو تھی پھر بھی زائرین کی تعداد ہزار سے بالا ہو جاتی تھی۔ اوسطاً دو ہزار آدمی دونوں وقت کھانا آپ کے ساتھ کھاتے تھے۔

آپ کے تشریف لے جانے سے پہلے کلکتہ میں زنا، شراب خوری وغیرہ کا بازار خوب گرم تھا۔ ہزاروں عورتیں عصمت فروشی کی وبا میں مبتلا تھیں۔ ہزاروں مرد بے نکاحی عورتیں گھروں میں ڈالے ہوئے تھے۔ ختنہ کی سنت تقریباً متروک تھی۔

حضرت سید صاحب کی تبلیغ و تلقین سے انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔ شراب کے ٹھیکیدار ایسے سراسیمہ ہوئے کہ ٹھیکہ کی منسوخیت کی درخواستیں دیں۔ ہزاروں غیر مختونوں کی ختنہ کرائی گئیں۔ جن کی تعداد اسقدر زیادہ ہو گئی تھی کہ دس پندرہ آدمی قافلہ کے اُن کی خدمت میں مشغول رہتے۔

دس پندرہ ہندو یومیہ مشرف باسلام ہوتے تھے۔

مولانا اسمٰعیل صاحب شہید اور مولانا عبدالحیٔ صاحب پیر منگل اور جمعہ کو ظہر سے عصر تک وعظ فرماتے تھے۔ سید صاحب کے داد و دہش کی یہ حالت تھی کہ کسی سائل کے سوال کو رد کرنا آپ کے لئے ناممکن تھا۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ دس ہزار روپیہ آپ نے قیام کلکتہ کے دوران میں فقراء اور حاجتمندوں کو عطا کیا۔

حاجی جیون[1] بخش صاحب ایک مشہور سوداگر تھے۔ آپ کی وساطت سے انگریزوں نے بھی سید صاحب اور آپ کے رفقا کی تقریریں سننی چاہیں چنانچہ ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ جس میں انگریز مرد و زن اور بچوں کی تعداد دس ہزار کے قریب تھی۔ مولانا اسمٰعیل صاحب نے سورۂ مریم کی تلاوت فرماکر ایسا رقت انگیز بیان فرمایا کہ ضبط ناممکن ہوگیا۔ روتے روتے سارے مجمع کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ آنسو پونچھتے پونچھتے رومال تر ہو گئے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ اثنار وعظ میں کسی شخص نے حضرت شہید سے دریافت کرلیا کہ انگریزوں کے مقابلہ پر جہاد کرنے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ حضرت شہید نے فرمایا۔ اس بے ضرر قوم سے جہاد نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں سکھوں سے جہاد کرنا ہے۔ جن کا ظلم حد سے تجاوز کرگیا ہے[2]

تین ماہ کامل سید صاحب کا کلکتہ میں قیام رہا۔ پھر سوانح احمدی کے اعداد و شمار کے بموجب گیارہ جہاز کرایہ کیے گئے اور گیارہ ہزار روپیہ بطور دوتُل[?] پیشگی ادا کردئے گئے۔ ہر ایک جہاز پر ایک ایک شخص کو امیر قافلہ مقرر کیا گیا۔ تقریباً ۱۲ ہزار روپیہ کا غلہ وغیرہ خرید کر جہازوں پر لاد لیا گیا۔

---

[1] آج کل انکی اولاد میں حافظ حاجی محمد اسمٰعیل صاحب رئیس دہلی ہیں۔ جن کی فیوض سے سینکڑوں بندگان خدا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مدارس عربیہ کی خاص طور پر خدمت کرتے ہیں متقی اور باخدا بزرگ ہیں۔ احقر بھی آپ کا مقروض اور ممنون ہے۔ خداوند عالم اس خاندان کو دارین کی دولتیں اور برکتیں عنایت فرمائے۔ آمین [2] سوانح احمدی صفحہ ۵۷

تاریخ دنیا میں یہ ایثار ہمیشہ سنہری حروف سے لکھا جائیگا کہ حجاج کے لئے آٹا پیسنے والوں میں مولانا شہید کا نمبر سب سے بڑھا ہوا تھا۔[ل]

سید صاحب کے جہاز کا نام "دریابقی" تھا۔ سید عبدالرحمٰن ساکن حضرموت ناخدا تھا۔ اور شیخ داؤد سورتی معلم تھا۔

مختصر یہ کہ گیارہ ماہ کے سفر کے بعد ۲۸ رشعبان المعظم ۱۲۳۶ھ کو یہ مبارک قافلہ بخیر وعافیت مکہ معظمہ کے حرم محترم میں داخل ہوا[ع] فراغت حج کے بعد قافلہ مدینہ طیبہ کی زیارت کے لئے روانہ ہوا۔ تقریباً ساڑھے چار ماہ مدینہ طیبہ میں قیام کرکے ۲۹ رربیع الاول ۱۲۳۸ھ کو مدینہ طیبہ سے روانہ ہوکر

ل اس موقعہ پر ارواح ثلثہ میں یہ لطیفہ بھی مذکور ہے کہ مولانا اسمٰعیل صاحب شہید کے ساتھ مولانا وجیہہ الدین صاحب (جو مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کے عم بزرگ تھے) آٹا پسوایا کرتے تھے۔ مولانا وجیہہ الدین صاحب سیاہ فام تھے۔ بدن بھاری تھا اور پیٹ بڑا۔ مولانا اسمٰعیل صاحب شہید آٹا پیستے پیستے کبھی اُنکے منھ پر آٹا پھینکدیتے تھے کبھی اُنکی توند پر۔ اور اس طرح ایک خاص لطف رکھتے تھے۔ نیز اسی حکایت میں یہ بھی ہے کہ چونکہ مولانا اسمٰعیل صاحب نہایت خوش طبع اور ظریف تھے۔ وہ سید صاحب کے ساتھ نہ ٹھہرتے تھے بلکہ الگ قیام کرتے تھے۔ اس سفر میں بھی ایک دوسرے جہاز میں قیام کیا۔ ۱۲ ارواح ثلاثہ ع اس زمانہ میں خانہ کعبہ میں مردوں اور عورتوں کا داخلہ ساتھ ساتھ ہوتا تھا۔ مولانا اسمٰعیل صاحب نے یہ حالت دیکھی تو وہ اور اُنکے ساتھی ننگی تلواریں لیکر کھڑے ہوگئے۔ اور فرمایا کہ اگر اسی طرح داخلہ ساتھ ساتھ ہوا تو ہم تلواروں سے سر اڑادیں گے۔ (باقی صفحہ ۷۰ پر ملاحظہ ہو)

وسط ربیع الثانی ۱۲۳۸ھ میں داخل مکہ ہوا۔

اور پھر یکم ذی قعدہ ۱۲۳۸ھ کو بعد مغرب مکہ معظمہ سے جدہ کی طرف روانہ ہوا۔ حجاز مقدس میں چودہ ماہ قیام رہا۔

محمد پاشا ؒ۔ اس زمانہ میں گورنر حجاز تھے۔ جنہوں نے آپ کا پورا احترام کیا۔ اور حسب ذیل مشہور علماء تھے۔ جن کو جناب سے ارادت اور عقیدت کا تعلق بھی رہا:۔

(۱) شیخ محمد عمر مفتی مکہ۔ عرف عبد الرسول۔ محدث حنفیہ استاذ عبد اللہ سراج شیخ العلماء (۲) سید عقیل (۳) سید حمزہ (۴) شیخ مصطفےٰ امام حنفی مصلے (۵) شیخ شمس الدین شطا مصری واعظ حرم محترم۔ (۶) شیخ محمد علی حنفی مدرس مکہ معظمہ (۷) شیخ احمد بن ادریس وزیر شاہ مغربی (آپ کو بخاری شریف مع قسطلانی حفظ تھی) (۸) شیخ بخارامی۔ مدرس مدینہ منورہ

جدہ سے روانہ ہو کر پندرہ روز مخا میں قیام رہا اور باوجودیکہ برسات کا موسم تھا۔ مگر دریا کا تلاطم اور طوفان اس قافلہ کے لئے سازگار رہا۔ چنانچہ صرف چودہ روز میں جہاز ساحل بمبئی پر پہنچ گئے۔

بمبئی سے بذریعہ جہاز کلکتہ پہنچے۔ اور کلکتہ میں دو ماہ قیام فرما کر گنگا کے راستہ سے مختلف مقامات پر قیام فرماتے ہوئے ۲۹ رشعبان المعظم ۱۲۳۹ھ کو دو سال ۱۱ ماہ بعد وطن عزیز میں داخل ہوئے۔

(بقیہ حاشیہ) اس پر بہت زیادہ شور و شغب ہوا مگر مولانا اور آپ کے ساتھی اپنی بات پر جمے رہے۔ اور مشترکہ داخلہ کو بند کرا کر چھوڑا" (ارواح ثلاثہ ص۶۱)

اسی اثنار میں لکھنؤ میں قیام ہوا۔ جہاں حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کی وفات کی افواہ سنی گئی۔ سید صاحب نے مولانا اسمٰعیل صاحب شہید کو اپنا خاص نقرئی گھوڑا سواری کے لیے دیا۔ اور فرمایا کہ دہلی پہنچ کر تحقیقی اطلاع دیں۔

حضرت شہید کا یہ حسن ادب تھا کہ دہلی تک گھوڑے کی باگ تھامے ہوئے پاپیادہ آئے اور گھوڑے پر سوار نہ ہوئے۔ کہ سید صاحب کی سواری کا گھوڑا ہے۔

دستے کفے جام شریعت درکفے زندان عشق

جہاد کی تیاری

ذی الحجہ ۱۲۳۹ھ سے آپ نے جہاد کی تیاری شروع کی
مولانا اسمٰعیل صاحب شہید اور مولانا عبدالحی صاحب رحمہما اللہ کو ترغیب
جہاد و ہجرت کے لئے اطراف ہندوستان میں بھیجا گیا۔
اب سید صاحب کا دولت کدہ خانقاہ کے بجائے چھاونی بن گیا تھا۔
مراقبہ اور مشاہدہ کے بجائے ہجرت اور جہاد کے وعظ ہوتے ۔ ذکر و شغل کی
آوازیں اگرچہ باقی تھیں ۔ مگر تلواروں اور نیام و خود کی کھڑکھڑاہٹ نے انکو دبالیا تھا
خرقہ و تسبیح کی جگہ ذرہ بکتر۔ تلوار اور بندوق نے لے لی تھی۔
اب آپ کی خدمت میں اسلحہ اور گھوڑوں کے تحفے پیش کئے جاتے تھے
بیعت ہوتی تو وہ بھی جہاد کی ۔ خطوط میں بھی جہادی رنگ غالب ہوتا۔ ترغیب
جہاد سرنامہ ہوتا۔
غازی پور کے ایک بزرگ شیخ فرزند علی صاحب نے دو گھوڑے
بہت سی وردیاں اور چالیس جلد قرآن پاک پیش کئے ۔ تو اُن کے ساتھ اپنے
لخت جگر "امجد" کو بھی راہ خدا میں قربان ہونے کے لئے پیش کر دیا۔
مشہور یہی ہے کہ صرف سکھوں سے جہاد کرنا مقصود تھا۔
چنانچہ مصنف سوانح احمدی کا بیان ہے کہ
براہ دور اندیشی شیخ غلام علی صاحب رئیس اعظم الہ آباد کی معرفت گورنر

اضلاع شمالی و مغربی کو اس تیاری جہاد کی اطلاع دیدی گئی تھی۔ جس کے جواب میں گورنر نے کہا تھا

"جبتک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو۔ ہم ایسی تیاری سے مانع نہیں۔"

جب تقریباً دو ہزار مجاہدین کا اجتماع ہوگیا تو آپ نے اُن کے تین حصے کر دئے اور ٹونک کی جانب کوچ کا حکم صادر فرمایا۔ کچھ عرصہ ٹونک میں قیام فرما کر اجمیر شریف اور پھر دہلی نزول اجلال فرمایا۔ اور پھر آغاز ۱۲۴۱ھ مطابق ۱۸۲۴ء دیوبند۔ سہارنپور۔ پانی پت۔ کرنال۔ اور تھانیسر وغیرہ سے گزرتے ہوئے مالیر کوٹلہ پہنچے۔ اور وہاں سے ممدوٹ۔ بہاولپور۔ حیدرآباد سندھ شکارپور۔ جاگن۔ خان گڑھ۔ درڈھاڈر۔ درہ بولن۔ پشین۔ قندھار اور کابل سے گزرتے ہوئے براہ خیبر داخل پنجاب ہوکر پشاور تشریف لائے۔ پشاور سے ہشت نگر (علاقہ یوسف زئی) میں پہنچکر موضع خویشگی میں قیام فرمایا۔ پھر نوشہرہ تشریف لے گئے۔

ان تمام مقامات پر سیکڑوں بندگان خدا حلقہ ارادت میں داخل ہوتے رہے۔ مصنف سوانح احمدی کا بیان ہے کہ

جب آپ ملک یوسف زئی میں پہنچے تو تمام ملک کے مرد اور عورت مثل پروانہ کے آپ پر فدا ہونے لگے۔ جس شتر پر آپ سوار ہوکر وہاں پہنچے تھے۔ ہزارہا عورتیں اس کے زین پوش کے جھالر کے تار تبرک کالے گئیں۔ اور جب تار باقی نہ رہے تو اونٹ کے بال تبرک خلائق بن گئے۔ اور کوئی اونٹ

کے نیچے کی خاک اپنے سر اور آنکھوں کو ملتا تھا۔

بہر حال اس طویل سفر کے بعد سب سے پہلے مقام ہشت نگر میں قیام کیا گیا۔ فاقہ اور عسرت کی حالت یہ تھی کہ تین تین غازیوں میں ایک تاملوٹ غلہ تقسیم کیا جاتا تھا۔

اگلے روز امیر دوست محمد خاں والی پشاور کے بھائی سردار سید محمد خاں بیعت سے مشرف ہوئے۔

سکھ دربار سکھ دربار نے حضرت سید صاحب کے ارادہ کی خبر پاکر سردار بدھ سنگھ کو دس ہزار فوج کے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔ جس نے ہشت نگر سے سات آٹھ میل کے فاصلہ پر دریائے لنڈہ کے دوسری جانب بمقام اکوڑہ۔ خیمے ڈال دئے۔

سید صاحب نے شرعی قانون کے بموجب سکھ دربار کو ایک اطلاع نامہ بھیجا جس کا مضمون یہ تھا۔

(۱) اسلام قبول کر لو۔ تو تم ہمارے مساوی ہو گے (۲) ورنہ ہماری ماتحتی قبول کر کے جزیہ دینا قبول کر د۔ (۳) ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔

سردار بدھ سنگھ نے سب سے پہلے شمشیر نامی ایک مسلمان کو جاسوس بنا کر بھیجا۔ مگر وہ فوراً ہی گرفتار کر لیا گیا۔ اور سید صاحب کے رحم وکرم نے اس کو معاف فرما کر اللہ بخش جمعدار کی ہمراہ رات کو دریا سے پار کرا دیا۔

امیر خاں دوسرے روز رئیس اکوڑہ۔ امیر خاں جو قوم خٹک کا سردار تھا۔ حاضر ہوا۔ اور بیعت سے مشرف ہوا۔ امیر خاں نے کہا کہ اس کا بھتیجا خواص خان

پسر فیروز خاں سکھوں کا حامی ہے۔ اور وہی بدھ سنگھ کو لیکر آیا ہے۔

اقدام امیر خاں نے مشورہ دیا کہ چونکہ بدھ سنگھ ملک ہمتہ میں آ کر حملہ کرنا چاہتا ہے جو بہت زیادہ خطرناک ہے۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ لشکر اسلام اقدام کرکے دریا لنڈہ کو عبور کرے۔ اور بدھ سنگھ کو اقدام سے روک دے۔ اس رائے کو مناسب سمجھا گیا۔ اور لشکر کو کوچ کا حکم صادر فرمایا اکوڑہ کے متصل موضع خویشگی میں قیام کیا گیا۔

لشکر کی تقسیم سید صاحب کے لشکر کی تعداد اس وقت تقریباً پانچ ہزار تھی۔ آپ نے لشکر کو آٹھ حصوں میں حسب ذیل تقسیم کر دیا۔

(۱) مقدمۃ الجیش۔ سردار مولانا اسمٰعیل صاحب شہیدؒ۔

(۲) میمنہ۔ سردار خود سید صاحب اور نائب مولانا محمد یوسف صاحب پھلتی

(۳) میسرہ۔ سردار سید محمد یعقوب صاحب۔ نائب شیخ بڈھن

(۴) ساقۃ العسکر۔ سردار اللہ بخش خاں صاحب۔

(۵) سردار ملا لال محمد قندھاری۔

(۶) سردار ملا قطب الدین ننگرہاری۔

(۷) سردار میرزا احمد بیگ پنجابی۔

(۸) سردار جعفر خاں قندھاری۔

آخر الذکر چار جماعتیں قلب لشکر میں رہتی تھیں۔ نویں جماعت اور تھی جو فاضل اور معین لشکر کے طور پر رہتی تھی۔ خیمے نصب کرنا وغیرہ اس جماعت کا کام تھا۔

سب سے پہلا شب خون ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۲ھ مطابق ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء خویشگی سے حرکت کر کے لشکر اسلام نوشہرہ پہنچا۔ اور سردار بدھ سنگھ اکوڑہ میں داخل ہوگیا۔

اسلامی جاسوسوں نے اطلاع دی کہ بدھ سنگھ حملہ کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا حکم صادر ہوا کہ کوئی شخص ہتھیار نہ کھولے۔

نماز ظہر کے بعد فتح و نصرت کی دعا کی گئی۔ اور منتخب نوجوانوں کو شب خون کے لئے مُرتب کیا گیا۔ اللہ بخش خاں جمعدار کو اس سریہ (دستہ) کا سردار مقرر کیا گیا اور حکم ہوا کہ دریائے لنڈہ کے اُس کنارے جا کر مناسب جگہ تجویز کر آئیں۔ اور مغرب سے پیشتر کھانے پینے کی ضروریات سے فارغ ہو جائیں۔ آدھی رات تک یہ تمام دستہ دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ تین گھنٹہ شب باقی تھی جب وہ سکھ فوج کی خاربندی کو طے کر کے لشکر کے قلب پر جا پہنچا۔ سنتری کے فائر سے شیخ باقر علی صاحب عظیم آبادی نے جام شہادت نوش کیا۔

اگرچہ اللہ بخش صاحب جمعدار خود بھی شہید ہو گئے۔ جن کی شہادت کے بعد اکبر خاں صاحب نے لشکر کی قیادت کی۔ مگر شب خون بہت کامیاب رہا۔ اس سریہ میں جو کچھ تھوڑی سی ابتری نمودار ہوئی وہ سرحدیوں کے باعث جنہوں نے قبل از وقت لوٹ شروع کر دی۔

بہرحال سردار بدھ سنگھ اس شب خون سے اس قدر خائف ہوا کہ اس نے اکوڑہ سے فوراً کوچ کا حکم دیدیا۔ اور تین کوس پیچھے ہٹ کر موضع سیدوں میں چھاؤنی ڈالی۔

۳۷ ہندوستانی لشکر اسلام کے شہید اور ۳۵ مجروح ہوئے۔ جبکہ سکھ فوج کے سات سو ہلاک اور اسی قدر زخمی ہوئے۔

اس کامیاب شبخون سے مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ سرحدیوں نے مبارکباد دینی شروع کی۔ سکھ دہشت زدہ ہو گئے۔

دو روز بعد یعنی ۲۲ جمادی الاولی ۱۲۴۲ھ کو قلعہ ہنڈ کے سردار خادی خاں نے آکر بیعت کی اور سارے لشکر کو قلعہ ہنڈ میں لے گیا۔ جو شاہی زمانہ کا نہایت مستحکم دریا اباسین کے کنارے پُر فضا مقام پر واقع تھا۔ یہیں لشکر کی قیامگاہ مقرر ہوئی۔

شبخون حضرو دریا اباسین سے تین چار کوس دوسرے کنارہ پر ایک بازار تھا۔ جس کو "حضرو" کہا جاتا تھا۔ یہاں بڑے بڑے دولت مند مہاجن آباد تھے۔ اور اس کے قریب سکھوں کی ایک گڑھی تھی۔ جس میں ایک توپ رکھی ہوئی تھی۔ جس سے گھاٹ کی نگرانی کی جاتی تھی۔

سرحدی پٹھانوں نے سید صاحب سے اس گڑھی پر شبخون کی اجازت چاہی۔ سید صاحب نے شبخون اکوڑہ میں مجاہدین کی شہادت اور اُن کی خستگی کا ذکر کرتے ہوئے معذرت پیش کی۔ مگر سرحدی پٹھانوں نے اصرار کیا کہ ہندوستانی مجاہدین کے بغیر تنہا سرحدی اس مہم کو انجام دیں گے۔ سید صاحب نے ان کے اصرار پر شبخون کی اجازت دیدی۔ مگر ان حضرات کے پیش نظر بازار کی دولت تھی۔ چنانچہ دشمن کی قوت کو توڑے بغیر بازار کا مال لیکر یہ لوگ روانہ ہو گئے۔ سکھ سپاہیوں نے ان کا تعاقب کیا۔ ایک طرف مال

کا لالچ اور دوسری طرف تعاقب کرنے والوں کی مدافعت۔ غرض ان کی حالت بہت خستہ ہو گی۔ سید صاحب کو اطلاع پہنچی تو فوراً خادیخاں کو حکم دیا کہ اپنے آدمیوں کو زیر کمان "انور شاہ" کمک کے لئے روانہ کرو۔

چنانچہ اس دستہ کے پہنچنے سے سکھ پسپا ہوئے اور شبخوں مارنے والوں کی جان بچی۔ دو آدمی اس دستہ کے شہید ہوئے۔

باقاعدہ امامت اور بیعت جبکہ اس علاقہ میں ایک آزاد پناہ گاہ بھی حاصل ہو گئی تھی تو ضرورت تھی کہ نظم ونسق۔ نیز شرعی حکم کی تعمیل کرتے ہوئے باقاعدہ ایک امام منتخب کیا جائے۔ علاوہ ازیں پچھلی دو لڑائیوں میں اس کا بھی تجربہ ہو گیا تھا کہ مال غنیمت کے متعلق احتیاط نہیں برتی جاتی۔ مقامی لوگ جو کچھ ہاتھ لگتا ہے گھر لیجاتے ہیں۔ قواعد شریعت کے بموجب اس کو تقسیم نہیں کیا جاتا۔ نیز حملہ اور شبخوں وغیرہ کے لئے بھی خود رائی کا اظہار ہوا تھا۔ اس قسم کے امور کا لحاظ کرتے ہوئے ضروری معلوم ہوا کہ باقاعدہ کسی صاحب کو امام اور امیر تسلیم کر لیا جائے۔

بالاتفاق حضرت سید صاحب کو امامت کے لئے منتخب کیا گیا۔ اور ۱۲ رجمادی الثانیہ ۱۲۴۲ھ کو آپ کے دست مبارک پر امامت وخلافت کی بیعت کی گئی۔ آپ کے نام کا خطبہ جاری ہوا۔

سردار یار محمد خاں۔ سلطان محمد خاں اور سردار پیر محمد خاں حاکمان پشاور نے بذریعہ خطوط آپ کی امامت تسلیم کی۔ اور اسی تاریخ کو قیام امامت وخلافت کی اطلاع ہندوستان کے علماء کو بھی دی گئی۔ چنانچہ

علماء ہند نے آپ کی امامت تسلیم کرلی۔

چند روز بعد سرداران پشاور لشکر اور توپ خانہ لیکر نوشہرہ کے کے قریب "سرمائی" مقام پر پہنچے۔ اور اطلاع دی کہ ہم آپ کی زیر قیادت سکھوں سے جہاد کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ چنانچہ حضرت سید صاحب نے سردار اشرف خاں اور سردار خادیخاں کو پانسو مجاہدین کے ساتھ اُن کی ملاقات کے لئے روانہ کردیا۔ نوشہرہ میں ان سب سرداروں کی باہم ملاقات ہوئی اور پھر اشرف خاں اور خادی خاں "ہنڈو" واپس آئے۔ مختصر یہ کہ سرداران پشاور کی معیت کے بعد حضرت سید صاحب کی طاقت بہت کافی ہوگئی۔ اگرچہ مالی حالت اتنی سقیم تھی کہ سید صاحب کے رفقا بسا اوقات درخت کے پتوں اور گھاس پات پر قناعت کرتے تھے۔

مصنف سوانح احمدی لکھتے ہیں۔

سید صاحب کے ماتحت ایک لاکھ فوج | اس وقت سرداران پشاور دیگر سرداران سمہ اور مجاہدین ہندوستان کی مجموعی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی جو امیرالمومنین کے زیر حکم ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار تھی۔

---

۷ سوانح احمدی صـ ۱۰۲

جنگ سیدو اور سرداران پشاور کی بے وفائی

سرداران پشاور حضرت سید صاحب کے ہمراہ تھے۔ لیکن غالب خیال یہ ہے کہ حضرت سید صاحب کی امامت کو اپنی سرداری کے لئے پیغام فنا خیال کرتے تھے۔ اور بہت ممکن ہے سرداران سمہ کی رقابت بھی در پردہ اُن کو مضطرب کئے ہوئے ہو۔

علاوہ ازیں اگرچہ اسلامی جذبہ اُن کو سید صاحب کی طرف کھینچ سکتا تھا۔ مگر سید صاحب کی فتح و نصرت بہر حال مشکوک تھی۔ جس کی بنا پر پالیسی یہی رہی کہ وہ سکھوں سے بھی ساز باز رکھیں۔ تاکہ ان کی سرداری بہر حال باقی رہ سکے۔

افسوس حب جاہ۔ انسان کو بزدل اور منافق بنا دیتی ہے۔ کاش جذبۂ ایمانی۔ حب جاہ پر غالب ہوتا۔ تو وہ سید صاحب کی مخلصانہ حمایت کرکے دارین کی سعادت حاصل کر لیتے۔

بہر حال سیدو کے میدان میں تقریباً ایک لاکھ فوج کا اجتماع ہے۔ خاص چہل پہل ہے۔ رونق ہے۔ مجاہدین اگرچہ تہی دست۔ تہی شکم۔ فاقہ مست ہیں۔ مگر وہ خوش ہیں کہ جس مقصد کے لئے انہوں نے احباب و اقارب کو چھوڑا۔ عزیز بچوں اور عزیز ترین دُلہنوں کو الوداع کہا۔ وطن کو اور وطن کی دلچسپیوں کو خیر باد کہا۔ اس کی جھلک اُن کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ محبوبہ کامرانی اگرچہ ہم کنار نہیں۔ مگر صرف چلمن کی آڑ باقی ہے۔ مگر

"تا در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال"

آج معرکہ کا دن ہے۔ میدان میں دونوں طرف صفیں آراستہ ہو چکی ہیں۔ قلب لشکر میں سید صاحب کا انتظار ہو رہا ہے۔ یار محمد خاں ایک ہاتھی در دولت پر بھیج چکے ہیں۔ عبادت انتظار کر رہے ہیں۔ کہ سید صاحب تشریف لائیں اور سوار ہوں۔

مولانا اسمعیل صاحب شہید تشریف لاتے ہیں کہ حضرت سید صاحب کو صف بندی کی اطلاع کر دیں۔ خیمہ کا پردہ اٹھا کر اندر تشریف لے جاتے ہیں۔ تو ایک عجیب ماجرا دیکھ کر ششدر رہ جاتے ہیں۔

سید صاحب بیہوش پڑے ہیں۔ قے جاری ہے۔ بظاہر زہر کا اثر ہے جو قے کے ساتھ خود بخود خارج ہو رہا ہے۔

مولانا اسمعیل صاحب کے پہنچنے سے سید صاحب کچھ ہوشیار ہوتے۔ دریافت کیا "جنگ شروع ہو گئی"

مولانا اسمعیل صاحب۔ فوجیں صف بستہ ہو چکی ہیں۔

امیر المومنین حکم فرماتے ہیں "مجھے اٹھا کر ہاتھی پر بٹھا دو۔ اور قلب لشکر میں پہنچا دو۔ ایسا نہ ہو میری غیر حاضری سے دشمن خوش ہو۔ یا مجاہدین کی ہمتیں پست ہو جائیں"

بہر حال خدام سید صاحب کو اٹھا کر ہاتھی پر سوار کراتے ہیں۔ ہاتھی میدان جنگ کی طرف روانہ ہو کر قلب لشکر میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ جنگ شروع ہوتی ہے مجاہدین کا ایک دستہ اقدام کرتا ہے اور سکھوں کی فوج میں گھس جاتا ہے

سرداران ہمہ بھی اُن کی پشت پر ہیں۔
درانی یعنی سرداران پشاور کے دستے پہاڑیوں سے توپ اور بندوقیں سر کر رہے ہیں۔ مگر افسوس کہ توپ اور بندوقوں میں خالی بارود بھری جاتی ہے۔
بہرحال گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی تو ایک عجیب گل کھلا۔
درانی فوج کے تقریباً دوسو آدمی سکھ فوج میں گئے اور اطمینان سے واپس چلے آتے۔ اور جب سرداران پشاور کے پاس پہنچے تو یہ سردار اپنی تمام فوجوں کے ساتھ میدان چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کے فرار ہوتے ہی نقشہ جنگ بدل گیا۔
سرداران ہمہ بھی بددل ہو کر فرار ہو گئے۔ اور صرف ہندوستانی مجاہدین میدان میں باقی رہ گئے۔ سکھوں نے خود سے یا (بموجب بیان سوانح احمدی) درانیوں کے ایما سے حضرت سید صاحب کے ہاتھی کو پہچان لیا۔ تو اس کو توپوں کی زد پر رکھ لیا۔
موقعہ تھا کہ فیلبان چابکدستی سے ہاتھی کو گولوں کی زد سے بچاتا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی سازش کا رازدار تھا۔ جوں توں کر کے ہاتھی کو اپنی جگہ سے ہٹایا گیا تو اب محسوس ہوا کہ وہ لنگڑا رہا ہے۔
سازشوں کے پے در پے انکشافات نے مومنین قانتین کو حیرت زدہ کر دیا۔
بہرحال سید صاحب کو ہاتھی سے اُتار کر گھوڑے پر سوار کرایا گیا۔

اور ہوشیاری کے ساتھ میدان سے فوج کو نکال کر قیام گاہ پر لایا گیا۔ میدان سکھوں کے ہاتھ رہا۔ مگر اس کا سبب سرداران پشاور کی غداری تھا۔

سید صاحب کو سردار فتح خاں کے مشورہ کے بموجب موضع چند لئی میں پہنچا دیا گیا۔ آٹھ روز تک آپ پر بیہوشی طاری رہی۔ ہوش آنے پر تمام حالات معلوم کئے۔

اخوند میر صاحب موضع چند لئی سے سید صاحب کو موضع مکدری میں لے گئے۔ سازش کے متعلق تحقیق و تفتیش شروع ہوئی۔ تو زہر کھلانے کا جرم ولی محمد اور نذر محمد پر ثابت ہوا جو کشمیر کے رہنے والے شیعہ مذہب۔ یار محمد خاں کے نوکر تھے۔ اور کھانا پکانے کے لئے یار محمد خاں نے ان کو امیر المومنین کی خدمت میں بھیج رکھا تھا۔ کھچڑی اور گنڈیریوں میں زہر ملا کر کھلایا گیا تھا۔ دونوں مجرموں کو گرفتار کرکے امیر المومنین کے حضور میں پیش کیا گیا مگر سید صاحب کا سب سے بڑا انتقام عفو تقصیر تھا۔ لا تثریب علیکم الیوم اذہبوا طلقا کچھ مجاہدین خفیہ طور پر ان دونوں کے قتل کے درپے ہوئے تو آپ نے خفیہ طور پر بوقت شب اُن کو فرار کر دیا۔

سرحدی قبائل میں دورہ سرداران پشاور کی دغا بازی اگرچہ پست ہمتوں کی کمر توڑنے کے لئے کافی تھی۔ مگر یہ بندگان خدا یاس اور نا امیدی کے مفہوم سے ناآشنا تھے۔

سردیوں کا موسم۔ برف باری کی شدت۔ مجاہدین کے پاس نہ۔ ہنے

کو مکان - نہ اوڑھنے کو کپڑا - نہ کھانے کو غلّہ - نہ رسد کا کوئی انتظام - اُن کا سامان رسد درختوں کی پتیاں - گھاس کی جڑیں تھیں - یا وہ دعوتیں جو گاہے گاہے قبائل اور مواضعات کے باشندے کر دیا کرتے تھے -

خوش حالی ہوتی تو ایک مٹھی جوار کی ملتی - جس کو ہمیں گرنشاشتہ کے طور پر پانی میں جوش دیکر نمک ملا کر پی لیا کرتے تھے - یہ اس آسمانی فوج کا راشن تھا -

مگر جب راہ خدا میں - عیش و آرام چھوڑا - اعزا اقارب کو جدا کیا - تو ان مصائب کی کیا حقیقت - ہاں ظاہر بیں اور جاہ پرستوں کے لئے ان مصائب پر صبر و استقامت ناممکن تھا -

سرداران پشاور کی غداری کے بعد ضرورت محسوس کی گئی کہ ہندوستانی مجاہدین کی طرح باشندگان سرحد کے قلوب میں بھی ایثار اور خلوص کی روح پھونکی جائے - چنانچہ امیر المومنین نے قبائل اور مواضعات کے دورہ کا قصد فرمایا -

آپ لشکر سمیت اولاً موضع نواکئی میں پہنچے - پھر علاقہ بنیر - اور سوات کا دورہ کیا - ان ممالک کے باشندگان حلقہ بگوش ہو گئے -

مجاہدین کی بھی حتی المقدور مدارات کی - جس سے ان کی خستہ حالی دور ہوئی

مولانا محمد یوسف صاحب پھلتی کی وفات | اسی دورہ کے اثنا میں جب کہ آپ بمقام "کوٹ گرام" فروکش تھے - تو مولانا محمد یوسف صاحب پھلتی کا انتقال ہو گیا -

سید صاحب نے فرمایا "لشکر کا قطب رخصت ہو گیا"

ہندوستان سے جدید قافلوں کی آمد

ان ہی ایام میں ہندوستان سے نئے مجاہدین کے دستے پہنچے۔
ہندوستان کے تمام قافلے سندھ۔ قندھار۔ کابل کا چکر کاٹ کر مدتوں میں سید صاحب تک پہنچتے تھے۔ جدید وار دین کے سرداروں کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں :-

(۱) مولانا قلندر صاحب (۲) مولانا احمد اللہ صاحب (۳) مولا عبدالحئی صاحب (۴) میاں مقیم صاحب رامپوری۔ یہ قافلے اپنے ساتھ کچھ ضروری خرچ بھی لے کر آئے تھے۔

پنجتار عیدالاضحیٰ ۱۲۴۲ھ سے چند روز پیشتر آپ بمقام "پنجتار" واپس آ گئے۔ اور اسی مقام کو "مستقر" ہیڈ کوارٹر" بنا لیا۔ مجاہدین نے بھی کچھ دنوں قیام کرنے کے لئے کمریں کھول دیں

اصحاب صفہ کی مثال آج کل لشکر پر بہت فراخی تھی۔ یعنی فی کس ایک ایک تاملوٹ غلہ روزانہ ملتا تھا۔ عیدالاضحیٰ کے روز ایک ایک سیر گوشت بھی تقسیم ہوا۔ کپڑے دھونے کے لئے صابون بھی سرکار سے ملتا تھا۔ مجاہدین اپنے حصہ کا آٹا خود پیس لیتے تھے۔ اور موقعہ ملا تو پن چکی میں پسوا لیتے تھے۔ لکڑیاں خود ہی جنگل سے لاتے تھے۔

سید صاحب اگرچہ امیرالمومنین تھے۔ مگر یہ ایسے امیرالمومنین تھے جن کو سیدنا صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کی سیرت از بر تھی ۔۔۔

بلکہ وظیفۂ زندگی تھی۔ کچھ پنجابیوں کو متفرق کاموں کے لئے پانچ پانچ روپیہ ماہانہ اور خوراک پر نوکر بھی رکھ لیا تھا۔

فراوانیٔ جمعیت دورہ ختم ہوا۔ جمعیت فراہم ہوئی۔ تو خوانین اور سرداران قبائل کی درخواستیں آنے لگیں۔ کہ ان کے قبیلہ میں تشریف لاکر سکھوں سے جہاد کیا جائے۔ مگر سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ قبائل کی باہمی چپقلش اب بھی ختم نہ ہوئی تھی۔ کسی قبیلہ کی امداد اس کے حریف کے عناد اور مخالفت کا سبب ہو جاتی تھی۔

شب خون ڈمگہ حبیب اللہ خاں رئیس پکھلی کا وزیر امیرالمومنین کے حضور میں باریاب ہوا۔ اور درخواست پیش کی کہ" ایک گڑھی پر سکھوں نے حملہ کرکے اس کے بیٹے کو محصور کر لیا ہے۔" امداد کے لئے مجاہدین کا ایک دستہ روانہ فرمائیے۔"

چنانچہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو حبیب اللہ خاں کی امداد کے لئے مامور فرمایا گیا۔ میاں محمد مقیم صاحب رامپوری کو ایک سو مجاہدین اور چند تجربہ کار افسران فوج کی ہمراہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی معیت میں روانہ کیا گیا۔

پکھلی اور چھچھ ہزار کے ناظم "ہری سنگھ" نے جب حضرت شہید کے آمد کی خبر سنی تو فوراً "پھول سنگھ" افسر فوج کو مدد کے لئے بلا لیا۔ جو دو تین ہزار فوج لیکر اس کی امداد کے لئے پہنچ گیا۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے میدان میں نکل کر جنگ کرنے کے بجائے شب خون کا ارادہ کیا۔

میاں محمد مقیم صاحب رامپوری کو افسر اور مولوی خیرالدین صاحب کو

کو نائب مقرر کر کے اور پچاس مجاہدین کے ساتھ تقریباً ایک ہزار مقامی لوگوں کی جمعیت اُن کی ہمراہ کر کے "ڈمگہ" کی جانب سے روانہ کئے گئے - مگر مقامی لوگوں میں سے تو سات سو کھسک گئے اب صرف ساڑھے تین سو کی جمعیت پھولنگھ کے مقابلہ جا ڈٹی - اور خار بندی کے اندر گھس کر اچانک حملہ کر دیا - سکھ فوج ابھی تیار نہ ہونے پائی تھی کہ سر دھڑ سے جدا ہونے لگے - ایک بڑی تعداد مقتول ہوئی باقی فرار ہوئے -

مقامی پٹھانوں نے اُس کا مال لوٹ کر بھاگنا شروع کر دیا - اب صرف پچاس مجاہدین کا دستہ میدان میں رہ گیا -

سکھوں نے حملہ آوروں کی تعداد دریافت کرنے کے لئے ڈمگہ کے چھپروں میں آگ لگا دی - جب روشنی ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ صرف ایک مٹھی بھر جماعت ہے - اُنہوں نے اکٹھے ہو کر پھر حملہ شروع کیا - مگر اب مزدرت مقابلہ نہ تھی - میاں محمد مقیم صاحب اور میاں خیرالدین صاحب نہایت ہوشیاری اور پھرتی کے ساتھ اپنے زخمیوں کو اٹھا کر قیامگاہ کی طرف روانہ ہو گئے - سکھ اسقدر وحشت زدہ اور خستہ ہو چکے تھے - کہ ان حضرات کی پسپائی کو غنیمت جانا اور تعاقب کا ارادہ بھی نہ کیا -

اس شب خون میں تقریباً تین سو سکھ کام آئے اور مجاہدین صرف ۷ شہید ہوئے اور سات زخمی -

جنگ شنگاری | چار وقت کے فاقہ کے بعد شبخون ڈمگہ سے چند گھنٹے پیشتر شام کے وقت کچھ غلہ میسر آ گیا تھا - جس سے اس دستہ کا فاقہ ٹوٹا -

مجاہدین ڈگمہ جب روانہ ہو چکے تو ابھی باقی ماندہ حضرات کھانے پینے ہی میں مشغول تھے کہ سکھوں کا ایک بڑا لشکر نمودار ہوا۔ حضرت شہیدؒ نے صرف بارہ آدمی اپنی ہمراہ لیکر اس لشکر کے ہزاروں فوجیوں پر اچانک حملہ کر دیا۔ جس سے سکھوں کا بہت کافی نقصان ہوا۔ تقریبًا سو سکھ مارے گئے۔ اور یہ بارہ آدمی صحیح سالم رہے۔ البتہ مولانا اسمٰعیل صاحب شہید کی انگلی پر ایک گولی لگ گئی۔ جس سے اتنا خون بہنے لگا کہ جب آپ نے بندوق بھرنی چاہی تو خون سے بارود تر ہو گئی۔

ان دونوں لڑائیوں میں اگرچہ ۷ مجاہدین شہید ہو گئے۔ مگر کامیابی مجاہدین کی رہی اور مقصود بھی پورا ہو گیا۔ یعنی ان ہی حملوں کی سراسیمگی کے باعث سکھ قیدیوں کی طرف سے کچھ غافل ہو گئے۔ اور حبیب اللہ خاں صاحب کا لڑکا نکل کر مکان پہنچ گیا۔ چار سو سے زائد سکھ کام آئے۔

ہندوستانی قافلوں کی آمد مولانا اسمٰعیل صاحب ابھی پنجتار نہ پہنچے تھے کہ ہندوستانی مجاہدین کے جدید قافلوں کی آمد معلوم ہوئی۔ جن میں مندرجہ ذیل حضرات سردار اور عمائد تھے۔ مجموعی تعداد تقریبًا چھ سو تھی:۔

سید احمد علی صاحب ہمشیر زادہ حضرت سید صاحب قدس اللہ سرہما۔

مولانا مظہر علی صاحب عظیم آبادی۔ مولانا خرم علی صاحب بلہوری۔

مولانا محمد علی صاحب رامپوری۔ مولانا محبوب علی صاحب دہلوی۔

مگر مولانا محبوب علی صاحب دہلوی نے کوئی خدمت انجام دینے کے

بجائے مجاہدین کو ورغلانا شروع کر دیا۔ حضرت سید صاحب پر طرح طرح کی نکتہ چینی شروع کی۔ آخر کو واپس چلے آئے۔ اور اپنے جیسے خام خیال آرام طلبوں کو بھی ہمراہ لے آئے۔ اور پھر ہندوستان میں پہنچ کر سید صاحب کے برخلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔ حتی کہ ایک عرصہ تک قافلوں کی روانگی بند رہی۔ پھر جب خطوط کے ذریعہ سے حقیقت کو واضح کیا گیا تو معاونین جہاد یعنی حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اس فتنہ کو دفع کر سکے۔ اور جدید قافلے روانہ کر سکے۔

بہر حال مولوی محبوب علی صاحب کی شر انگیزی سے اس تحریک کو صدمہ ضرور پہنچا۔

مولانا عبدالحی صاحب کی وفات ۸ رشعبان ۱۲۴۳ھ بروز یکشنبہ بمقام کھہر حضرت مولانا عبدالحی صاحب نے بعارضہ بواسیر اس جہان فانی سے کوچ کیا۔ جو اس جماعت کے لیئے ناقابل تلافی نقصان تھا۔

کاشغری خاتون سے نکاح انہیں ایام میں حضرت سید صاحب نے اُس خاتون سے نکاح کیا جس کو سلیمان بادشاہ شاہ کاشغر نے سید صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا۔ ان کے بطن سے ایک صاحبزادی تولد ہوئیں۔ جن کا اسم گرامی "ہاجرہ" تھا۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد یہ ٹونک چلی آئی تھیں۔ ۱۳۰۱ھ ہجری میں ٹونک میں وفات پائی۔

جنگ اتمان زئی سرداران پشاور کا عناد کچھ زیادہ بڑھا۔ اور انہوں نے حضرت سید صاحب کے مقابلہ پر فوج کشی کی۔ چار ہزار فوج اور دو ضرب توپ

لیکر دریائے لنڈھ سے عبور کر کے بمقام آتمان زئی آ پہنچے۔ حضرت سید صاحب بمقام کھہر قیام فرما تھے۔ ارباب بہرام خاں، ارباب جمعہ خاں اور دیگر خوانین اور سمہ و سوات کے سرداروں سے مشورہ کر کے سید صاحب نے مقابلہ کے لئے تیاری شروع کر دی۔ لشکر کے دو حصے کر دئے گئے اور دو جانب سے درانیوں کے لشکر پر شبخون مارا گیا۔ نتیجہ خاطر خواہ ظاہر ہوا۔ درانیوں کو اپنی سرکشی اور بے وفائی کا خاصہ سبق مل گیا۔

امیر بخارا سے تعلقات سرداران پشاور سید صاحب کے لئے بہترین طاقت بن سکتے تھے۔ اور اگر خدا نے اُن کو بصیرت دی ہوتی تو وہ سید صاحب کی امداد سے پورے ہندوستان پر از سر نو قبضہ کر سکتے تھے۔ لیکن زوال اور ادبار انسان کی عقل کو بیکار کر دیتا ہے۔ سب سے پہلے اس کی قوت فکریہ برباد ہوتی ہے۔ اور سرمایہ بصیرت کا دیوالہ نکلتا ہے۔

جنگ سیدو کے بعد جنگ آتمان زئی نے پشاوری سرداروں کی نسبت رہی سہی امیدوں پر بھی پانی پھیر دیا۔

اب سید صاحب نے دوسرے ممالک سے اپنے تعلقات استوار اور محکم کرنا چاہے۔ چنانچہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اور ارباب شوریٰ کے مشورہ سے ایک سفارت امیر بخارا کے پاس بھیجی گئی۔

سفارت دس آدمیوں پر مشتمل تھی۔ مولانا نظام الدین صاحب چشتی اس سفارت کے امیر اور رئیس تھے۔ ایک قرآن مجید مُطلّا بطور ہدیہ ارسال کیا گیا۔

امیر بخارا کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے ایک مکتوب سفرا کے حوالہ کیا گیا۔ جس کے خاص خاص جملے حسب ذیل ہیں:۔

ہرگاہ بلاد اہل اسلام در دست کفار لئام افتد بر جماہیر اہل اسلام عموماً و بر مشاہیر حکام خصوصاً واجب و موکد می گردد کہ سعی و کوشش در مقابلہ و مقاتلہ آنہا بجا آرند۔ تا وقتیکہ بلاد مسلمین را از قبضۂ ایشاں برآرند۔ والا آثم و گنہگار شوند۔ وعاصی و گنہگا۔ دازدرگاہ قبول مردود می گردند۔ واز بارگاہ قرب مطرود[1]

جہاد اور امامت کا تذکرہ فرماتے ہوئے اپنے نصب العین کو تحریر فرماتے ہیں

بلکہ مقصود از برپا کردن تمام ایں معرکہ پیرائی و عربدہ آرائی غیر از اعلاء کلمۃ رب العالمین واحیاء سنت سید المرسلین و استخلاص بلاد مومنین از دست کفرہ متمردین چیزی دیگر نیست[2]۔

اس کے بعد درخواست کی ہے کہ شاہ موصوف بذات خود اگر اس طرف متوجہ نہ ہوسکیں تو سید صاحب اور اُن کے رفقاء کی عسکری اور مالی امداد فرمائیں۔

ملکی نظم ۔ یکم شعبان ۱۲۴۴ھ بروز جمعہ تقریباً دو ہزار علما اور روساء وخوانین نے دست مبارک پر بیعت کی۔ فتح خاں صاحب رئیس پنجتاران میں پیش پیش تھے۔

[1] سوانح احمدی صفحہ ۱۹۰ [2] سوانح احمدی صفحہ ۱۹۱

اب شرعی اصول کے بموجب محروسہ علاقوں کا انتظام ہوا۔
فصل خصومات کے لئے جا بجا قاضی مقرر کئے گئے۔ صوم وصلوٰۃ۔
اور پابندی احکام کے لئے محتسب مقرر ہوئے۔ وصولی عشر کے لئے عمال مقرر
کئے گئے۔ اور اس طرح یہ علاقہ ایک چھوٹا سا دارالاسلام بن گیا۔
خادی خاں کی بغاوت خادی خاں جو اب تک حضرت سید صاحب کے
ساتھ تھا۔ دفعتہً باغی ہوگیا۔ وجہ بغاوت یہ بیان کی جاتی ہے کہ اُس نے
عُشر ادا کرنا منظور نہیں کیا۔
جنگ انٹورا صاحب جنگ پنچتار بہرحال خادی خاں نے سکھوں سے
ساز باز کرکے اُن سے فوجی امداد طلب کی۔ سکھ دربار سے اس مرتبہ ایک
فرانسیسی افسر "انٹورا" صاحب کی زیر سرکردگی پندرہ ہزار فوج۔ توپخانہ اور
شاہین کے ساتھ روانہ کی گئی۔ "انٹورا" ابھی حضرو ہی میں پڑاؤ کئے ہوئے تھا
کہ خادی خاں حاضر ہوا۔ اور اُس کو دریا اباسین کے اُس پار "ہند" یعنی اپنی
ریاست میں لے گیا۔ اور وہاں سے اس نے پنچتار کا راستہ بتایا۔ پنچتار ایک
پہاڑی مقام تھا۔ جس تک پہنچنے کے لئے دو پہاڑیوں کے بیچ میں سے گزرنا پڑتا
تھا۔ سید صاحب قدس اللہ سرہٗ نے حکم دیا کہ دونوں پہاڑیوں کے بیچ میں سنگین
دیوار قایم کی جائے اور اس پر توپیں نصب کردی جائیں
دیوار کی تیاری میں امیر المومنین بنفس نفیس تمام مجاہدین کے ساتھ
پتھر ڈھو رہے تھے۔ اور اس طرح سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اتباع
کرتے ہوئے غزوۂ خندق کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کر رہے تھے۔

۹۰۰
اس وقت مجاہدین کی تعداد کم وبیش نو سو تھی۔
مجاہدین کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اور ہر ایک دستہ کا نشان اور افسر علیحدہ علیحدہ مقرر کیا گیا۔
پہلے نشان کا نام صبغۃ اللہ۔ تھا اور اس پر زرد و سفید ریشم سے ومن یرغب عن ملۃ ابراھیم آخر پارہ تک درج تھا۔ اس کے علمبردار دادا ابو الحسن صاحب نصیر آبادی تھے۔
دوسرے نشان کا نام۔ مطیع اللہ تھا۔ اس پر سورہ بقرہ کا آخری رکوع درج تھا۔ غازی ابراہیم صاحب اس کے علمبردار تھے۔
تیسرے نشان کا نام فتح اللہ تھا۔ سورۂ محمد کا آخری رکوع اس پر نقش تھا۔ اس کے حامل محمد نامی عرب تھے۔
یہ فن سپہ گری کا کمال تھا کہ ان دستوں کو اس طرح کھڑا کیا گیا کہ غنیم نے جب دوربین سے ان کی تعداد معلوم کرنا چاہی تو وہ سراسیمہ ہو گیا۔
انٹورا صاحب اپنی دوربین کی غلط بینائی سے مرعوب تو پہلے ہی ہو گئے تھے مگر تاہم فوج کو بڑھنے کا حکم دیا۔ اور جب فوج پہاڑیوں کے بیچ میں پہنچی تو مجاہدین نے اس پر اس شدت سے حملہ کیا کہ انٹورا صاحب کو بھاگتے ہی بن پڑی۔
مجاہدین نے دور تک تعاقب کیا۔ بہت سے سکھ ہلاک ہوئے اور انٹورا پر اتنا خوف غالب ہوا کہ اس نے لاہور پہنچکر دم لیا۔ یہ خداوندی امداد تھی
شبخون ہنڈ | انٹورا صاحب فرار ہوئے۔ ضرورت سمجھی گئی کہ خادیخاں

بائی کی تادیب کی جائے۔ جس نے نہ صرف بغاوت کی۔ بلکہ سکھوں سے امداد طلب کی۔ اور پھر سکھ فوج نے ان علاقوں میں گزرتے ہوئے مساجد کو مسمار۔ مدارس اور خانقاہوں کو تباہ و برباد کیا۔ غریبوں کے جھونپڑوں کو جلایا۔ ان حرکتوں کو خادی خاں اپنی آنکھ سے دیکھتا رہا۔ اور اُنکی ہمنوائی کرتا رہا۔

چنانچہ مولانا اسمٰعیل صاحب نے ۱۰ جنوری کو ایک مختصر سا دستہ لیکر قلعہ ہنڈ کی طرف کوچ کیا۔ قلعہ کے قریب پوشیدہ مقام پر چھپ کر اس دستہ نے رات گزاری۔ صبح صادق کے وقت جب اہل قلعہ نے ضروریات کے لئے دروازہ کھولا۔ تو اس دستہ نے فوراً پہنچکر دروازہ پر قبضہ کرلیا۔ اور پھر آگے بڑھتا ہوا خادی خاں کے خوابگاہ تک پہنچ گیا۔ مقابلہ کرنے والے قتل ہوئے۔ خادی خاں کوسٹھے پر چڑھ کر حملہ کرنے لگا۔ جس کو کسی مجاہد کی گولی نے ختم کردیا۔ اور اسطرح قلعہ پر مجاہدین کا پرچم لہرانے لگا۔

ریاست ہنڈ کی داخلی بدامنی قلعہ فتح ہوگیا۔ مولانا اسمٰعیل صاحب نے یہیں قیام فرمالیا۔ مگر ریاست ہنڈ ادائیگی عشر پر پہلے سے راضی نہ تھی۔ خادی خاں کی ہلاکت سے ایک برہمی ریاست میں پیدا ہوگئی۔ جس کے باعث کچھ عرصہ تک بدامنی رہی۔ حتیٰ کہ پنجتار سے ہنڈ تک سلسلہ رسل و رسائل بھی منقطع ہوگیا۔ مگر تھوڑے دنوں بعد ہی اس پر قابو پالیا گیا۔

خادی خاں کا بھائی امیر خاں تھا۔ وہ اندرونی طور پر سرداران پشاور سے بھی ساز باز رکھتا تھا۔ مگر ظاہراً سید صاحب کی خدمت میں حاضر رہتا اور

چاپلوسی کرتا رہتا۔ اُس کی درخواست تھی کہ قلعہ ہنڈ اُس کو مرحمت ہو۔ سید صاحب نے ایک مرتبہ اُس سے وعدہ بھی کر لیا تھا۔ مگر مولانا اسمٰعیل صاحب جیسے ارکان مشورہ نے جب اندرونی قباحتوں سے مطلع کیا تو سید صاحب کو اپنا وعدہ واپس لینا پڑا۔

سرداران پشاور کا دوبارہ حملہ | سید صاحب امیر المومنین اگرچہ بادشاہ نہ تھے۔ مگر فرمانروا ضرور ہو گئے تھے۔ ایک علاقہ پر باقاعدہ قبضہ بھی ہو چکا تھا۔ عشر وغیرہ کی تحصیل بھی ہونے لگی تھی

اگرچہ سید صاحب کے عزائم امت مسلمہ کے لیے رحمت تھے۔ مگر متمرد۔ خود سر بندگان عیش وطرب کو نفس پرستی اس قدر محبوب تھی کہ وہ عاقبت اور انجام سے بے خبر ہو کر سید صاحب کی قیادت کو ہوا پرستانہ آزادی کے لئے مہلک جانتے تھے۔ تمرد اور ہوا پرستی کے جذبات نے پھر سر اٹھایا۔ اور یار محمد خاں۔ سردار پشاور نے امیر خاں برادر خادیخاں مقتول کی اندرونی برہمی کو غنیمت سمجھا اور امیر خاں کی ریاست میں موضع ہریانہ میں اپنے دستے جمع کرنے شروع کر دئے۔ جو وقتاً فوقتاً مجاہدین سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے۔ اور شکست کھاتے رہتے پھر ایک لشکر فراہم کر کے چھ ضرب توپ۔ چند شاہین اور ہاتھی اونٹ وغیرہ لیکر نہایت کروفر سے ہریانہ پہنچا۔ آس پاس کے ہم جنس اور جنبوا پٹھان بھی اکٹھے ہو گئے۔ اور اعلان جنگ ہو گیا۔

سید صاحب نے بھی تیاری شروع کی۔ مولانا اسمٰعیل صاحب کو قلعہ ہنڈ

سمت طلب فرمایا۔ اور مولانا مظہر علی صاحب عظیم آبادی کو مجاہدین کے ساتھ قلعہ
ہنڈ کا قلعہ دار مقرر کر دیا۔

جنگ زیدہ ۱۵ ربیع الاول ۱۲۴۵ھ روز دوشنبہ یار محمد خاں کا لشکر
زیدہ پہنچ گیا۔ جہاں سید صاحب اپنے لشکر کو فراہم کر چکے تھے۔ چونکہ فوراً ہی
یار محمد خاں کو حملہ کرنا مشکل تھا اُس نے دو روز گفتگوئے صلح میں صرف
کر دئے۔ اور جب اس مدت میں سامان فراہم کر لیا تو صلح کی گفتگو نہایت
نخوت کے ساتھ بند کر دی۔ اور اطلاع کر دی کہ اگر اب کوئی آئیگا۔ تو اس
کا سر قلم کر لیا جائے گا۔

رات کا وقت ہے برف بار پہاڑوں کی چوٹیاں سفید چادریں
اوڑھے قاصدوں کی آمد و رفت کا تماشا دیکھ رہی ہیں۔

آخری قاصد۔ نخوت آمیز پیغام دیکر روانہ ہوا۔ وہ ابھی پہاڑی
راستہ کے نشیب و فراز کو طے کر ہی رہا تھا کہ امیر المؤمنین نے یلغار کا حکم
صادر فرما دیا۔

چند منٹ پیشتر قاصد یار محمد خاں کے لشکر میں پہنچا تھا کہ مولانا اسمٰعیل صاحب
سر فروش مجاہدین کا دستہ لئے ہوئے وسط لشکر میں نمودار ہوئے۔ نعرہ
تکبیر بلند کر کے ایک دم حملہ کر دیا۔ اور نخوت و غرور کے پتلوں کے لئے عذاب
الٰہی بن کر تہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔

درانیوں کی توپوں نے گولہ اندازی شروع کرنا چاہی۔ مگر اولا تو

وہ بے سود تھی۔ علاوہ ازیں فوراً مجاہدین توپوں پر چڑھ گئے۔ توپچیوں کی مشکیں کس دیں۔ اور توپوں پر قبضہ کر لیا۔

یار محمد خاں۔ تکبر اور تمرد کا دیوتا اپنے خیمہ میں نو گرفتار حسینوں کے ساتھ عیش و طرب میں مشغول تھا۔ کہ تلواروں کی جھنکار اور بندوقوں کے فیر نے اس کو سراسیمہ کر دیا۔

وہ جان بچا کر ایک طرف کو بھاگنے لگا۔ حتیٰ کہ زخمی ہوا۔ پھر پٹ ور پہنچنے سے پہلے موضع ہریان اور موضع دو ڈھیر کے درمیان ہلاک ہو گیا۔

غرض چشم زدن میں درانی لشکر کا سارا غرور خاک میں مل گیا۔ عیش و طرب کے پتلے خاک و خون میں تڑپنے لگے۔ فوج کے سپاہی اس بدحواسی سے بھاگے کہ جوتیاں بھی وہیں چھوڑ گئے۔

مجاہدین نے توپ۔ بندوق اور جنگی سامان پر قبضہ کر لیا۔ باقی تمام سامان مقامی لوگ لوٹ کر لے گئے۔ پلاؤ کی دیگیں تیار تھیں۔ امیر عسکر کے حکم کے بموجب اُن کو مجاہدین نے تناول کیا۔

امیر المومنین کو جب فتح کی خبر پہنچی تو سراسر تواضع و انکسار بنکر سجدہ شکر ادا کیا۔

سید صاحب مظفر و منصور دار الخلافت "پنجتار" کو واپس ہوئے

ے بیان کیا جاتا ہے کہ اطراف کے دیہات سے کچھ حسین چھوکریاں گرفتار کر کے لائی گئی تھیں۔ جب مجاہدین نے خیمہ میں ان گرفتاران بلا کو دیکھا تو بحفاظت ان کے مکانات پر پہنچا دیا۔ (سوانح احمدی)

گئے تو راستہ میں بچوں اور عورتوں نے مبارکباد کی آوازوں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ مستورات نے دف بجا بجا کر اپنی خوشیوں کا اظہار کیا۔ اس معرکہ میں چار مجاہدین شہید ہوئے اور ۷ زخمی۔ مخالفین سیکڑوں کی تعداد میں زخمی اور ہلاک ہوئے۔

سرداران پشاور اور سکھ دربار | باشندگان پشاور کے دل حضرت سید صاحب کی طرف مائل تھے۔ مگر یار محمد خاں کی وفات کے بعد اس کا بھائی "سلطان محمد خاں" سابق بغض و عناد کے باوجود جدید جذبہ انتقام سے دیوانہ ہو گیا تھا۔

اس کے پاس دو گھوڑے نہایت بیش قیمت تھے۔ لیلے اور مرواؔ ان کے نام تھے۔ رنجیت سنگھ ان کو خریدنا چاہتا تھا۔ مگر انکار کر دیا تھا۔ اب اسی جذبہ کی بنا پر اس نے وہ دونوں گھوڑے رنجیت سنگھ کی خدمت میں بطور نذر بھیج کر امداد و اعانت کی درخواست کی۔ ابھی غالباً سکھوں کی طرف سے کوئی خاص کمک نہ پہنچی تھی کہ سلطان محمد خاں کی ماں کے طعنہ نے کہ "اتنی بڑی فوج اور خزانہ کا مالک ہوتے ہوئے ایک فقیر سے اپنے بھائی کے خون کا انتقام نہیں لے سکتا" اس کو اور بھی زیادہ برانگیختہ کر دیا۔

اور جب سید صاحب تربیلا مقام پر سکھوں سے نبرد آزمائی میں مصروف تھے اس نے اپنی فوج ایک فرنگی افسر کیول صاحب کے زیر کمان قلعہ ہنڈ کی طرف بھیج دی۔ چونکہ وہاں صرف پچاس مجاہدین موجود تھے وہ اول تو قلعہ بند ہو کر مقابلہ کرتے رہے۔ مگر جب ان پر غلہ اور پانی بند کر دیا گیا تو چند روز

کے متواتر فاقہ کے بعد بیجان ہو کر گرفتار ہو گئے۔

جب سید صاحب کو قلعہ ہنڈ کی شکست کا علم ہوا۔ تو وہ فوراً اس طرف متوجہ ہوئے۔

سلطان محمد خاں۔ سید صاحب کی آمد کی خبر سنکر قلعہ چھوڑ کر بھاگا۔ مجاہدین کو گرفتار کر کے اس ارادہ سے ساتھ لے چلا تھا کہ راستہ میں بھائی کی قبر پر پہنچ کر اُن کو ذبح کریگا۔ مگر حسن اتفاق کہ مجاہدین موقعہ پاکر ہشت نگر مقام پر قید سے فرار ہو گئے اور بعافیت تمام سید صاحب کی خدمت میں پہنچا ر حاضر ہو گئے۔

لیکن اس اثنا میں قلعہ ہنڈ پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ جو امیر خاں برادر خادی خاں کی درخواست پر وہاں پہنچے تھے۔

لمحہ فکریہ بہت ممکن ہے سید صاحب کو پیشتر سے ان پیچیدگیوں کا خیال نہ ہو جو پیش ہو گئیں۔ وہ صرف سکھوں سے مقابلہ کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ مگر یہاں سکھوں کے دست راست درانی پٹھان ثابت ہوئے اب سید صاحب کو دو طرفہ مقابلہ کرنا تھا۔

اور لطف یہ کہ پیش آنے والے واقعات اس آگ کو اور ہوا دے رہے تھے خیال ہی کیا جاتا ہے اور ہم نے بھی بار بار یہی لکھا کہ سرداران پشاور کی سید صاحب کے حامی قبائل سے رقابت یا سرداران پشاور کی حب جاہ اور انانیت اس کا باعث تھا۔

مگر جنگ سیدو سے پیشتر ان ہی سرداران پشاور خادی خاں وغیرہ

کا سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لینا - اور پھر جنگ سیدو کے موقعہ پر سید صاحب کو زہر دلوانا اور خاص میدان جنگ سے فرار ہونا وغیرہ - اور اُس کے بعد - کیبول صاحب کا سلطان محمد خان کے ہاں جاکر افسر فوج مقرر ہونا ہمیں اس فیصلہ پر مجبور کرتا ہے کہ

"کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں"

جنگ امب امب ایک مقام تھا جو کشمیر کے راستہ میں پڑتا تھا - پایندہ خاں یہاں کا رئیس تھا - پشاور اور اطراف پشاور کی یہ دغابازیاں دیکھ کر سید صاحب نے ارادہ کیا کہ مجاہدین کا مرکز کشمیر کو قرار دیں - چنانچہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب مجاہدین کا ایک گروہ لیکر کشمیر کو روانہ بھی ہو گئے - لیکن جب امب کے قریب پہنچے تو پایندہ خاں نے متکبرانہ طرز پر اُن کو رستہ دینے سے انکار کر دیا - اور خود جنگ کے لئے تیار ہو گیا - مولانا اسمٰعیل صاحب واپس سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پایندہ خاں سے جنگ کی اجازت حاصل کر کے اور کچھ مزید کمک ہمراہ لے کر امب کی طرف روانہ ہوئے - پایندہ خاں کو اعلان جنگ کیا - اور اپنی فوج کو اس طرح تقسیم کر دیا کہ امب سب طرف سے گھر گیا - پایندہ خاں نے خود کو مجبور پاکر پیغام صلح بھیجا - جس کو مولانا نے منظور فرمایا - مگر پھر فوراً ہی دھوکے سے مجاہدین پر حملہ کرنے کے لئے فوجیں بھیجدیں - مجاہدین فوراً تیار ہو کر مقابلہ پر آ گئے -

پایندہ خاں کے سپاہیوں کو فرار ہونا پڑا - اور پھر پایندہ خاں بھی جان بچا کر ریاست چھوڑ کر دریا پار اباسین عبور کرتا ہوا - فرار ہو گیا - ۲ غازی اس

جنگ میں شہید ہوئے۔

انب پر قبضہ اور جدید بندوبست | فتح انب کے بعد سید صاحب نے اسی کو دار الخلافہ بنالیا۔ کیونکہ ایک جانب اونچے اونچے پہاڑوں کی مضبوط دیواریں اور دوسری جانب دریاء اباسین نے حصار کر رکھا تھا۔ متعلقین کو بھی یہیں بلا لیا۔ یہیں دفتر قایم کیا گیا۔ جو اس وقت کافی وسعت حاصل کر چکا تھا۔ نو دس محرر دفتر میں کام کرتے تھے۔ منشی محمدی صاحب میر منشی تھے۔

سید صاحب کی مہر پر "اسمہ احمد" کندہ تھا۔ وہ مولانا اسمعیل صاحب یا میر منشی منشی محمدی صاحب کے پاس رہتی۔ مولانا اسمعیل صاحب کی مہر پر "واذکر فی الکتاب اسمعیل" کندہ تھا۔ وہ اکثر منشی فضل الرحمٰن صاحب کے پاس رہتی تھی۔

مفتوحہ علاقہ میں عشر وغیرہ کا بندوبست کیا گیا۔ قاضی مقرر کئے گئے نماز وغیرہ کے متعلق محتسب مقرر ہوئے۔ برہنہ بدن نہانے کا عام رواج تھا اس پر تعزیر مقرر کی گئی۔ اب سید صاحب نے کشمیر کی جانب عنان توجہ موڑی۔

مولانا نظام الدین صاحب چشتی رح جو سفارت بخارا سے عرصہ ہوا واپس آچکے تھے۔ مبلغ کشمیر مقرر کئے گئے۔ علاقہ کاغان میں موصوف نے جاکر تبلیغ کی۔ دعوت جہاد پر سرگرمجوشی سے لبیک کہا گیا۔ سید ضامن شاہ صاحب وغیرہ کاغان کے چند سردار قدمبوسی کے لئے حاضر خدمت بھی ہوئے۔ اتفاق سے اس زمانہ میں کرپا رام صوبہ دار کشمیر معتوب ہوکر دربار لاہور میں طلب کر لیا گیا تھا۔ کشمیر خالی تھا۔ تو باشندگان کاغان کی درخواست گذری کہ سید صاحب

اس موقعہ پر کشمیر پہنچکر قابض ہو جائیں۔ مگر چونکہ کشمیریوں کی غداری مشہور تھی تو ارکان شوریٰ اور بالخصوص مولانا اسمٰعیل صاحب نے عرض کیا کہ کشمیر یہاں سے دس بارہ منزل ہے۔ یقیناً دربار لاہور آپ کی نقل و حرکت کی اطلاع پاتے ہی کشمیر فوجیں بھیجدے گا۔ تو اُس نادیدہ اور اجنبی ملک میں اور بھی زیادہ پریشانی ہوگی۔ لہٰذا اس وقت ارادہ ملتوی کیا گیا۔

سکھوں پر حملہ اور سفارت علاقہ انب کے بندوبست سے فراغت پاکر دریا ابا سین سے پار۔ سکھوں کے علاقہ پر حملہ کی تیاری شروع ہوئی چنانچہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب مجاہدین کا ایک دستہ لیکر اباسین کو عبور کرکے چنار گدھیوں پر حملہ آور ہوئے۔ اور اُن کو تسخیر بھی کر لیا۔ اور وہاں مسلمان گماشتے مقرر کرکے سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سکھ دربار نے فوراً ہی ۱۲ ہزار جوان زیر سرکردگی انتورا صاحب و راجہ شیر سنگھ صاحب مقابلہ کے لیئے روانہ کر دیئے۔ مگر چونکہ سکھ سردار دو تین معرکوں میں ان مجاہدین کی جانبازی اور سرفروشی کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ اس لیئے اولاً انہوں نے ایک سفارت بھیجی کہ دریا اباسین اُس پار کا علاقہ سید صاحب لے لیں اور ہم اُس جانب کے تمام مقبوضات سے دست بردار ہو جائیں گے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ اقدام کو روک دیں۔ اور دریا اباسین سے اس جانب کے رقبوں پر حملہ آور نہ ہوں۔

سکھ دربار کی سفارت کے ارکان حسب ذیل تھے:۔

(۱) سردار وزیر سنگھ جمعدار خسرو پورہ

(۲) حکیم عزیزالدین صاحب

مصنف سوانح احمدی کا بیان ہے کہ سید صاحب کی صداقت، ور آپ کے اخلاق وایثار کا سردار وزیر سنگھ پر اتنا اثر پڑا کہ وہ مشرف باسلام ہوگیا۔ مگر حسب اجازت سید صاحب اُس نے اس خبر کو مخفی رکھا

بہرحال سید صاحب نے بھی جواب دینے کے لیے مولانا خیرالدین صاحب شیر کوٹی اور حاجی بہادر شاہ خاں وغیرہ آٹھ ارکان پر مشتمل ایک سفارت ترتیب دی جس کو سکھوں سے گفتگو کرنے کے لیے آپ نے بھیجا۔ چنانچہ انٹورا صاحب سے جاکر مفصل گفتگو ہوئی۔ اگرچہ اس سفارت کی ناکامی یقینی تھی۔ چنانچہ انٹورا صاحب کی خواہش یہ تھی کہ سید صاحب ایک گھوڑا بطور نذرانہ راجہ کے لئے بھیجدیں۔

مگر مولانا خیرالدین صاحب کا جواب یہ تھا کہ " ہم ایک گھوڑا تو کیا گدھا بھی نہیں دے سکتے۔ ہم اس لئے آئے ہیں کہ سکھوں سے جزیہ وصول کیا کریں

مولانا خیرالدین صاحب انٹورا صاحب سے گفتگو کر کے واپس اپنے خیمہ میں پہنچے۔ دوسری ملاقات کا انتظار تھا کہ اگلے روز وزیر سنگھ موصوف (خفیہ نومسلم) نے آکر اطلاع دی کہ راجہ کھڑک سنگھ کے ڈیرہ پر دونوں فرانسیسی افسر اور امیر خاں براد خادیخاں مقتول کا مشورہ ہو رہا تھا۔ کہ یکبار یورش کی جائے۔ مولانا خیرالدین صاحب نے یہ خبر پاتے ہی اپنے ایک خاص آدمی کے ذریعہ سے حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس

کی اطلاع دے دی۔

چنانچہ شب کے آخری حصہ میں انٹورا صاحب فوج لیکر پنجتار کی طرف روانہ ہوئے اور بمقام "زیدہ" قیام کیا۔ جو پنجتار سے صرف چھ کوس کے فاصلہ پر تھا۔

سارا دن قیام کے انتظام میں گذر گیا۔ مگر جونہی رات کی تاریکی نے پہاڑی علاقہ کو ہو کا رقبہ بنایا، ساری فوج پر ایک دہشت طاری ہو گئی ہر شخص مجاہدین کے شب خون کے خطرہ سے پریشان تھا۔ افسران فوج نے بہت کچھ اطمینان دلایا۔ مگر بے سود رہا۔ حتیٰ کہ آخری شب میں ساری فوج فرار ہو گئی۔ اور دریا "لنڈہ" کو عبور کر کے مجاہدین کے خطرہ کو رفع کرنے کے لئے اُس کا پل بھی توڑ دیا۔

اسی طرح قلعہ ہنڈ پر جو دستہ متعین تھا۔ وہ خود بخود خالی کر کے فرار ہو گیا۔

سکھ فوج کی روانگی پر مولانا خیرالدین صاحب اور دیگر سفراء بھی بلا اطلاع روانہ ہو گئے۔ اور سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ساری گفتگو نقل کر دی۔

سید صاحب کا اصلاحی قدم اور سرکشوں کی مخالفت کا دوسرا بہانہ

علاقہ سمہ کے پٹھانوں کا دستور تھا کہ شادی یا رخصتی کے وقت لڑکی والا بہت کافی رقم لڑکے والے سے وصول کرتا تھا۔ غیر قابل برداشت رقم کے مطالبہ کا نتیجہ یہ تھا کہ لڑکیاں بوڑھی ہو جاتی تھیں اور اُن کو بدنصیب

نہ ہوتا تھا۔ اور اسی طرح لڑکے بھی کنوارے رہتے۔ یا بھیک مانگ کر مطالبہ پورا کرتے۔ بدچلنی۔ فحش کاری وغیرہ کی ہو بار اس کے سوا تھی۔ سید صاحب نے اس رسم قبیح کی اصلاح کو خدمت خلق کا اہم تریں فرض تصور کیا۔ چنانچہ سرداران قوم کو جمع کر کے مؤثر پیرایہ میں اس رسم کی قباحت اور اُس کے ہلاکت انگیز نتائج پر متنبہ کیا۔

چنانچہ عام طور پر اس دعوت اصلاح کو قبول کیا گیا۔ مگر کچھ وہ بھی تھے جنھوں نے برخلاف آواز اٹھائی۔

احمد خاں رئیس ہوتی مردان اس قدر برافروختہ ہوا کہ جلسہ میں بھی حاضر نہ ہوا۔ اور پھر اعلان بغاوت کر کے، اپنے بھائی کو اپنی گڑھی کی حفاظت کے لئے مامور کر کے خود درانیوں کے پاس پشاور چلا گیا۔ اور مقابلہ کے منصوبے کرنے لگا۔

بغاوت کی اطلاع پا کر مجاہدین کی ایک جماعت زیر سرکردگی حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب مولانا قاضی حبّان صاحب اور عبدالحمید خانصاحب رسالدار باغیوں کی تادیب کے لئے روانہ ہوئی۔ اور مظفر و منصور واپس ہوئی۔ البتہ قاضی حبان صاحب شہید ہو گئے۔ جو علاقہ سمہ وغیرہ میں سید صاحب کی جانب سے قاضی القضاۃ تھے۔

جنگ مہیار و فتح پشاور

احمد خاں ۔ درانیوں کے پاس پہنچا ۔ تو اُن کی دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دیکر دوبارہ برافروختہ کر دیا ۔ چنانچہ پورے اہتمام اور انتظام کے ساتھ سارے درانی اس مرتبہ حضرت سید صاحب اور مجاہدین کی بیخ کنی پر آمادہ ہو گئے ۔ اُن لوگوں نے اول علاقہ سمہ وغیرہ کے پٹھانوں کو دھمکیاں اور تہدید آمیز پیغام بھیجکر مرعوب کرنا چاہا ۔ اور پھر سلطان محمد خان درانیوں کی بہت بڑی جمعیت لیکر ہشت نگر پہنچ گیا ۔

سید صاحب نے اول پیغامات اور مراسلات بھیجکر سلطان محمد خان کو سمجھایا کہ ہمارا مقصد کلمہ گو برادران اسلام سے جنگ کرنا نہیں ۔ ہم سکھوں سے جنگ کرنے آئے ہیں ۔ آپ حضرات بار بار حملہ کر کے ہمیں تباہ کرنا چاہتے ہیں ۔۔ مگر تمام افہام و تفہیم بے سود تھی ۔ آخر کار جب معلوم ہوا کہ درانیوں کا لشکر بڑھتے بڑھتے مہیار پہنچ گیا ۔ تو سید صاحب مولانا اسمٰعیل صاحب وغیرہ کے ساتھ بنفس نفیس فوج لیکر مقابلہ کے لیے میدان میں آئے

مجاہدین نے اپنے دستور کے بموجب سب سے پہلے دشمن کی توپوں پر قبضہ کر کے گولہ اندازی کا رخ بدل دیا ۔ مگر تاہم ہزاروں درانیوں کا لشکر مجاہدین پر لوٹ پڑا ۔ درانی غصہ سے دانت چباتے ہوئے داڑھی دانتوں میں دبائے شیر کی طرح میدان میں گرج رہے تھے ۔ اور "سید کجاست سید کجاست" کہتے ہوئے سید صاحب کی تلاش میں سرگرداں تھے ۔ گویا اگر

سید صاحب ہاتھ لگ جاتے تو کچا چبا جاتے۔

مگر سید صاحب خود فن سپہ گری کے امام تھے۔ دو تین آدمی آپ کو بندوقیں بھر بھر دے رہے تھے۔ اور آپ "سید ہمیں است۔ سید ہمیں ست" کہتے ہوئے اپنے تلاش کرنے والوں کو خاک وخون میں پچھاڑ رہے تھے۔

چند گھنٹے کی گھمسان جنگ کے بعد درانیوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ اپنا تمام ساز و سامان اور اپنے مردوں اور زخمیوں کو چھوڑ کر میدان سے بھاگ گئے۔

مہیار کی یہ جنگ فتح و نصرت کے ساتھ ختم ہوئی تو اب ضرورت محسوس کی گئی کہ پشاور جو اُن کا مرکز تھا اُس کو تسخیر کیا جائے۔ تاکہ مادۂ فساد کا انقطاع ہو۔ اور اندرونی بغاوتوں کی جڑ کٹ جائے۔

چنانچہ سید صاحب نے پشاور پر حملہ کرنے کے لیے کوچ کا حکم صادر فرمایا سید صاحب کے عدل و انصاف کی شہرت نے عام باشندوں کو سید صاحب کا مشتاق کر دیا تھا۔ اور سلطان محمد خان وغیرہ کے ظلم و عیاشی سے وہ متنفر ہو چکے تھے۔ چنانچہ جس جس مقام پر مخلص مجاہدین کا لشکر گذرتا تھا۔ بوڑھے جوان حتیٰ کہ بچے اور عورتیں تک راستوں پر کھڑے ہو ہو کر سید صاحب اور مجاہدین کو دعائیں دیتے۔

دو تین مرتبہ جنگ میں شکست اور پھر عوام کی سید صاحب کے متعلق اس گرویدگی نے سلطان محمد خان کی ہمت پست کر دی۔ چار ناچار اس نے

خوشامدانہ طرز اختیار کیا۔ اور جب کہ سید صاحب بمقام "کمٹ فروسی" قیام فرما تھے سردار سلطان محمد خان کا وکیل ارباب فیض اللہ خاں مہمند سلطان محمد خان کی طرف سے معافی طلب کرنے کے لئے حاضر ہوا۔ پہلے روز تو یہ درخواست مسترد کر دی گئی۔ مگر دوسرے روز پھر وہی درخواست لے کر حاضر ہوا۔ چنانچہ کامیاب ہوا۔ اور سید صاحب کے انہیں اخلاق کا مشاہدہ کر لیا۔ جن کی رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کے خلف صادق اور جانشین برحق سے توقع کی جا سکتی تھی۔

عفو تقصیر کی درخواست کو عام طور پر چاپلوسی خیال کیا جاتا تھا۔ اور خدام کی ایک جماعت اس درخواست کو مسترد کرانا ہی ضروری سمجھتی تھی۔ مگر جس شخص کا مقصود ہی خدمت خلق اور بہبودی امت ہو وہ کس طرح درخواست عفو کو مسترد کر سکتا ہے۔

عفو تقصیر کے بعد حاکم پشاور کے انتخاب کا مسئلہ پیش آیا۔ اس موقع پر بھی اگرچہ ارباب بہرام خاں وغیرہ اپنے لئے درخواست کر رہے تھے۔ مگر رحمت عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے وارث و نائب کے لطف عام نے سلطان محمد خاں کی درخواست ہی کو شرف قبولیت بخشا

سلطان محمد خان نے باقاعدہ توبہ کی آیندہ کے لئے حضرت سید صاحب کے ارشادات پر کاربند رہنے کا عہد کیا۔ اور پشاور کی حکومت وولایت کا پروانہ حاصل کر کے بدستور حاکم پشاور بن گیا۔

سید صاحب نے مولانا سید مظہر علی صاحب کو قاضی شہر مقرر فرمایا۔ اور مولانا قمر الدین صاحب اور چند حضرات کو اُن کی امداد و اعانت کے لئے پشاور چھوڑا۔ اور خود پنجتار واپس تشریف لے آئے۔

اب سید صاحب اور مجاہدین کی حدود حکومت بہت بڑے علاقہ پر محیط ہو گئی تھی۔ سرحدی قبائل نے عموماً امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کا اقتدار تسلیم کر لیا تھا۔

اور خلافت راشدہ کے نمونہ کی ایک حکومت ہندوستان کے ایک گوشہ میں چشم فلک پھر دیکھ رہی تھی۔

حکومت مجاہدین کی سیاسی حیثیت اور آنیوالے خطرات

ہمیں اس موقعہ پر کچھ توقف کر کے اس اسلامی حکومت کے ماحول اور اُس کی سیاسی حیثیت پر نظر ڈالنی ہے۔

(۱) پہلے گذر چکا ہے کہ سید صاحب رح نے مولانا نظام الدین صاحب رح چشتی کی زیر قیادت ایک سفارت شاہ بخارا کے پاس بھیجی تھی۔ جو کتاب سید صاحب نے چشتی صاحب موصوف کے ذریعہ سے شاہ موصوف کے پاس بھیجا تھا اُس کا مضمون یہ تھا کہ:

ایک دار الاسلام کو کفار نے غلبہ پا کر دار الحرب بنا لیا ہے۔ امراء و سلاطین کا فرض ہے کہ وہ پھر اسکو دار الاسلام بنانے کی جد و جہد کریں۔

ہندوستانی مجاہدین کی ایک جماعت خدا کے نام پر میدان میں نکل آئی ہے۔ جس نے کوہستانی علاقہ کو اپنی پناہ گاہ بنایا ہے۔ آپ حضرات اس کی امداد فرمائیں۔ اگر بذات خود اس کی امداد کے لیئے نہ آسکیں تو عسکری اور مالی امداد سے تعاون فرمائیں۔

اسی قسم کے خطوط دیگر والیان ملک اور شاہان اسلام کے نام بھی ارسال فرمائے تھے۔ جن کو سوانح احمدی کے آخر میں درج بھی کیا گیا ہے اجمالی طور پر سوانح احمدی کی مندرجہ ذیل عبارت سے حضرت سید صاحب کی تجویز پر کافی روشنی پڑ جاتی ہے۔

"جنگ زیدہ کے دوران میں مولانا نظام الدین صاحب چشتی اور اُن کے رفقا بخیریت سفارت بخارا سے واپس آگئے۔ اُنہوں نے بیان کیا کہ وہ مکتوب گرامی جو بنام بخارا ہمارے ساتھ تھا اور جس میں جہاد کی ترغیب دی گئی تھی ہم نے شاہ کٹور حاکم کاشغر اور حاکم فیض آباد اور محمد مراد بیگ حاکم قندھار وغیرہ اور بہت سے رئیسوں کو بھی دکھلا کر مجاہدین کی امداد پر آمادہ کیا۔

چنانچہ قیام جہاد کی نوید کو سُنکر ہر رئیس نے بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا۔ اور عندالطلب اپنی شرکت اور اعانت کا وعدہ کیا۔ اور جب ہم بخارا میں پہنچے تو شاہ بخارا نے بھی اُس نامۂ فیض شمامہ کو پڑھکر خوشی کے نقارے بجوائے اور بہایت اخلاق و تعظیم و تکریم سے پیش آیا۔ آخر کو شاہ بخارا کے امیروں اور مشیروں نے براہ حسد شاہ موصوف کو ورغلا کر یہ دھوکا

دیا کہ یہ سفیر در اصل انگریزی حکام کے بھیجے ہوئے جاسوس ہیں۔ تاکہ جہاد کے بہانے سے یہاں کے حالات معلوم کر کے حکام انگریزی کو خبر کر دیں۔ ان کو جلد رخصت کر دینا چاہئے۔ تب شاہ بخارا نے ایک اسپ ترکی اور کچھ دینار اور دو عمدہ یابو بطور ہدیہ دیگر مع جواب نامہ اس سفارت کو رخصت کر دیا"۔ [1]

اس قسم کے خطوط اور سفارتیں سید صاحب نے خانخانان خلجائی رئیس قلات۔ شاہ محمود سلطان ہرات۔ امیر دوست محمد خاں والی کابل حبیب اللہ خاں پسر عظیم اللہ خاں برادر دوست محمد خاں والی کابل۔ حاجی کاکڑ۔ مشیر اعظم دوست محمد خاں والی کابل۔ سردار امیر عالم خان باجوڑی۔ سلطان زمان شاہ۔ سلیمان شاہ بادشاہ کاشغر۔ وغیرہ وغیرہ کے پاس بھیجیں۔ ان تمام خطوط کو سوانح احمدی کے آخر میں درج کیا گیا ہے۔

(۲) ان خطوط کے جواب میں عموماً سید صاحب کی اعانت و امداد کا وعدہ کیا گیا۔ یعنی ہندوستان پر فوج کشی اور جہاد کی ایک روح ان تمام اسلامی علاقوں میں تازہ کر دی گئی جو ہندوستان پر ایک ہزار سال پیشتر سے حملہ آور اور حاکم و فاتح رہے تھے۔

(۳) ہندوستان کے علماء۔ امراء اور عام مسلمانوں کے نام بھی تسلیم امامت کے اطلاع نامے۔ اور جہاد کی ترغیب و تبلیغ برابر ہوتی رہی۔ اور بلاشبہ ایک اضطراب عام مسلمانان ہند میں پیدا کر دیا گیا۔ جس کا اثر آج تک

---

[1] سوانح احمدی، ص ۱۱۵

بعض بعض علاقوں میں پایا جاتا ہے۔

(۴) ان خطوط اور مکاتیب میں اس قسم کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں

صرف با دراز مویان (سکھ) مقاتلہ داریم نہ با کلمہ گویان

و اسلام جویان و نہ با سرکار انگریزی مخاصمت داریم

و نہ ہیچ راہ منازعت کہ از رعایائے او ہستیم و حمایتش

از مظالم برا پا،

لیکن کیا انگریزی ڈپلومیسی بھی ان الفاظ سے مطمئن

ہو سکتی تھی ---؟

(۵) ہندوستان کے شمالی مغربی علاقہ میں (جو اس کو تمام دنیا ر

اسلام سے وابستہ کر دیتا ہے) کسی آزاد مسلم حکومت کا قیام لامحالہ

انگریزی عرض اطمینان کے لئے برق سوزاں تھا۔ اور جس قدر سکھ

حکومت اس کے قلع قمع کے درپے ہو سکتی تھی۔ اسی قدر انگریزی حکومت

کے لئے وقت کا اہم ترین سیاسی فرض تھا کہ اس کے استیصال میں

پوری طاقت صرف کر دے۔

(۶) کابل اور ایران سے ہندوستان کا قدیمی تعلق رہا ہے۔ سلاطین

مغلیہ کے آخری دور یعنی نادر شاہ کے حملہ تک کابل ہندوستان کا

صدر رہا تھا۔

سلطنت مغلیہ کی جانشیں حکومت (حکومت انگلشیہ) کا بھی مطمح

نظر یہی تھا کہ وہ کابل کو ہندوستان میں شامل کرلے۔ چنانچہ انیسویں صدی

پہلے نصف میں دو مرتبہ کابل پر حملہ ہوا۔ اور سید صاحب کے اس جہاد کے کچھ عرصہ بعد
انگریزی فوجوں نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ اگرچہ انگریز کو کابل میں استقلال
نصیب نہ ہو سکا۔ مگر اُس کی یہ تمنا ضرور رہے کہ یہ تمام سرحدی قبائل اُس کے
زیر نگیں ہوں۔ تاکہ وہ ان دشوار گزار پہاڑیوں کو خاطر خواہ فوجی استحکام
دیکر ہندوستان کے لئے غیر قابل تسخیر حصار بنا سکے۔ چنانچہ وہ اسی تمنا میں
آئے دن آزاد سرحد کے باشندوں پر آگ و خون کی بارش کرتا رہتا ہے۔
اور سرحد کے غیور مجاہدین کو سو سال گذر گئے ہیں کہ مشین گنوں اور توپوں
کے مقابلہ پر بہادر سینے پیش کر کے اپنی حریت باقی رکھتے ہوئے ۳۷ء
سے فقیر صاحب اپی مقابلہ پر ہیں۔

اللھم انصر من نصر دین محمد صلے اللہ علیہ وسلم

امور مذکورۂ بالا پر نظر ڈالنے سے اون خطرات کا اندازہ ہو سکتا ہے
جن میں سید صاحب اور مجاہدین کی حکومت چاروں طرف سے گھری ہوئی
تھی۔

خطرات کا ظہور سلطان محمد خان کی غداری

۱۸۳۱ء

حضرت مولانا سید مظہر علی صاحب قاضی پشاور کی شہادت

پشاور میں قاضی شہر مولانا سید مظہر علی صاحب نے شرعی قوانین کی بموجب انتظامات کر دئے۔ چند ماہ امن و امان سے گذر گئے۔ وہ سرزمین جو فسق و فجور ظلم و ستم۔ جور و جفا کا مرکز تھی۔ رشد و ہدیٰ کا مرکز بننے لگی۔ لیکن جس قوم کے حصہ میں ادبار لکھا تھا۔ جس کے عروج و ترقی کا ستارہ غروب ہو چکا تھا۔ اور جس کو انگریزی جھنڈوں کے نیچے غلامی کی ذلیل ترین زندگی بسر کرنی تھی۔ اس کے لئے کب ممکن تھا کہ وہ اقبال کے راستہ کا رخ کرتی۔

اسلامی نظم و نسق کے سامنے گردن جھکا کر رشد و ہدیٰ کی دعوت پر لبیک کہتی۔ بہیمانہ اور ہوا پرستانہ تباہ کن آزادیوں پر تہذیب اور اخلاق کی پابندیاں عائد کرتی۔

چنانچہ سلطان محمد خاں نے ایک جلسہ میں مولانا سید مظہر علی صاحب کو بلایا۔ بندگان ہوا و ہوس۔ نام نہاد مولویوں کا بھی اجتماع تھا۔

سلطان محمد خاں نے قاضی صاحب سے دریافت کیا۔ آپ نے میرے بھائی "یار محمد خاں" کو کیوں قتل کیا؟

سید مظہر علی صاحب نے اس قسم کے لایعنی اور بے ہودہ سوالات کے دندان شکن جواب دئے۔

مجلس ختم ہوئی۔ قاضی صاحب قیامگاہ پر تشریف لائے۔ سید صاحب کو واقعات کی اطلاع دی۔ خطرات سے آگاہ کیا۔ مگر ہنوز جواب پہنچا بھی نہیں تھا۔ کہ اگلے روز پھر قاضی صاحب اور ارباب فیض اللہ خاں صاحب کو بلوا کر اپنے سامنے قتل کرا دیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

آپ کو یاد ہوگا کہ یہی فیض اللہ خاں تھا جس نے پوری جد و جہد کر کے سلطان محمد خان کی جان بخشی کرا کر اس کو پشاور کی حکومت دلوائی تھی۔۔ مگر افسوس۔ نکوئی با بداں کردن چناں ست

که بد کردن بجائے نیک مرداں

بدترین غداری

۲ فیصد

بے گناہوں کا قتل عام

میں اس وقت حیران ہوں کہ کتاب کو یہیں ختم کر دوں یا کچھ آگے لکھوں جو سانحہ زیر تحریر ہے۔ قلم لرز رہا ہے۔ جگر شق ہوا جاتا ہے۔

ہمیں کچھ اپنے اُن بھائیوں کی شکایت کرنی ہے۔ جن کو آج اس دور غلامی میں ہم آزادی کا سہارا تصور کرتے ہیں۔ طبیعت نہیں چاہتی کہ سرحد کے غیور پٹھانوں کی تاریک تاریخ دہرائی جائے۔ مگر مقصد گندگی اچھالنا نہیں بلکہ نصیحت اور تذکار ہے۔

ہمارا حال۔ ہماری ماضی کا نتیجہ ہے۔ ہمیں ماضی پر غور کرنا ہے۔ تاکہ اس سے سبق حاصل کر کے مستقبل کو درست کر سکیں۔

آج کی ذلت وخواری۔ غلامی اور زیردستی۔ کل کی بدعنوانیوں کا نتیجہ ہے۔ آج ہمیں حالت درست کر لینی ہے۔ تاکہ آنے والا کل تباہی سے محفوظ رہے۔ اور آنے والی نسلوں کے دل ہمارے لئے دعاگو ہوں ولتنظر نفس ما قدمت لغد ہر شخص دیکھ لے کہ اس نے آنیوالے دن کے لئے کیا پیش کیا ہے

درانیوں نے قاضی اسلام مولانا سید مظہر علی کے ساتھ جو کچھ کیا۔ بدترین جرم تھا۔ شرمناک تھا۔ ایسا جرم تھا جس سے شہر تباہ ہو جاتے ہیں قومیں برباد ہو جاتی ہیں۔ اقبال ادبار سے بدل جاتا ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ بدتر اور قبیح وہ فعل ہے جو باشندگان علاقہ تنمہ نے اُن مجاہدین کے ساتھ کیا جو اُن کے مواضعات میں تحصیل عشر وغیرہ کے لئے مامور تھے۔

سلطان محمد خان نے جب قاضی شہر کو شہید کیا تو اُس سے پیشتر علاقہ تنمہ میں نفرت انگیزی کی گہری سازش کر چکا تھا۔

مراسم نکاح کی اصلاح۔ عقد بیوگان کی ترغیب۔ تقرر عشر۔ افعال قبیحہ پر احتساب۔ سید صاحب اور مجاہدین کے یہی جرم تھے۔ جس سے متمرد اور سرکش لعینوں کو ہر ایک حیاسوز اور انسانیت کش فعل پر آمادہ کیا جا سکتا تھا۔

آج کل ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ذاتی اغراض کو مذہب کا

جامہ پہنا کر مذہب کے نام پر مذہب کو برباد کیا جاتا ہے۔
آج اُن کی کمی نہیں جن کو صورۃً یا سیرۃً مذہب سے کوئی تعلق نہیں
مگر تحفظ مذہب کے دعویدار بنکر یہ درس دے رہے ہیں کہ:
"مولوی کا مذہب غلط ہے"
سوال یہ ہے کہ صحیح مذہب کہاں ہے۔ اور جس جانب کی رہنمائی
کی جارہی ہے آیا وہاں مذہب ہے۔؟ آنے والی نسلیں اس دجل اور
فتنہ پردازی پر ہمیشہ نفرت بھیجا کریں گی کہ:
ایک شخص جو اہل سنت والجماعت کے مذہب سے خارج۔ اسلامی عقائد
سے ناآشنا۔ اسلامی اعمال پر ہمیشہ سے استہزار اور مذاق اُڑانے کا
عادی۔ نکاح کو ایک معاشرتی معاملہ قرار دیکر یاری عورت سے اولاد حاصل
کرنے والا۔ اور اُسی کی تعلیم اور سنت کے بموجب اُس کی لڑکی غیر مسلم سے
نکاح کرنے والی۔ مگر اس قسم کی تمام قباحتوں اور لعنتوں کے باوجود۔ وہ
مسلمانوں کا امام۔ قائد اعظم۔ امیر المومنین اور اس سے بھی عجیب یہ کہ وہ
اعلان کرے کہ میں نے مولویوں کا اقتدار ختم کردیا۔ اور اس کے باوجود
نادان اور سادہ لوح مولویوں کی ایک جماعت اُس کے ساتھ۔
اور اس کے بالمقابل وہ مقدس نفوس۔ وہ برگزیدہ علماء جن پر
تمام اسلامی ممالک ناز کرتے ہیں۔ جن کے زہد و تقویٰ۔ جن کے تفقہ فی الدین۔
جن کی علمی بصیرت۔ درایت اور مہارت کی تمام دنیا قائل ہو وہ اس غلام
آباد ہندوستان میں کافر کہلائیں اُن سے مسلمانوں کو نفرت دلائی جائے۔ اور اُنکو ہندو پرست
——— اسلام فروش اور مذہب فروش لکھا جائے ———

کیا اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور بوالعجبی ہو سکتی ہے۔؟

بہر حال ہمیں دورِ حاضر کی مثال دیکر ایک دوسری حقیقت پر روشنی ڈالنی ہے۔ سید صاحب رح کی اصلاحات کے برخلاف جو پروپاگنڈا کیا گیا اُس کو بھی ایک مذہبی رنگ دیا گیا۔ اور کچھ خود غرض لوگوں نے مذہب کا نام لے کر اس سادہ لوح قوم کو مشتعل کر دیا جس نے ۱۹۲۹ء میں برطانوی جاسوسوں کے غلط پروپیگنڈے کا شکار ہو کر اپنے جاں نثار اور عاشقِ قوم بادشاہ "شاہ امان اللہ خاں" کو جلاوطن کر کے بچہ سقہ جیسے ننگِ انسانیت کو تختِ کابل پر متمکن کر دیا تھا۔

اغوا کی صورت سید صاحب زمانہ سے کچھ عرصہ پیشتر حجاز مقدس میں عبدالوہاب نجدی کے جانشینوں کا فتنہ اُٹھ چکا تھا۔

سنہ ۱۲۱۵ھ میں سعد نے مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کو فتح کر کے اُس مرقد مقدس کے ساتھ بھی گستاخیاں کیں تھیں جو ہمارے عقیدے میں زمین و آسمان کے تمام مقامات سے اشرف و برتر ہے (زاد اللہ شرفہا)

مگر صرف نو سال حکومت کرنے پایا تھا کہ ترکی کمانڈر "علی پاشا" نے ۱۸۱۲ء یعنی تقریباً ۱۲۲۷ھ میں اُس کو حجاز مقدس سے شکست دے کر نکال دیا۔ جس کے دو سال بعد سعد کے بیٹے عبداللہ نے پھر سر شورش کی تو ترکی فوج نے اس کو گرفتار کر کے قسطنطنیہ روانہ کر دیا۔ اور ۱۹ دسمبر ۱۸۱۹ء کو مسجد ایا صوفیہ میں اُس کی گردن اُڑا دی گئی۔ پھر اُس کا بیٹا ترکوں کے خوف سے اِدھر اُدھر بھاگا بھاگا پھرا۔ آخرکار ریاض میں وہ بھی گرفتار

ہو کر قتل کیا گیا۔

اس کے بعد چند سال تک یہ خاندان تباہ اور برباد ہی رہا ۱۸۳۰ء میں پھر کچھ انتظام درست ہوا تو عبداللہ کے پوتے فضل نے نظام حکومت قائم کر کے باپ دادا کی مردہ خلافت میں کچھ زندگی کے آثار پیدا کئے۔

حضرت سید صاحب اور حضرت شہید وغیرہ نے ۱۲۳۶ء اور ۱۲۳۷ء مطابق ۱۸۲۵ء و ۱۸۲۶ء میں فریضہ حج ادا کر کے ایک سال حجاز مقدس میں قیام کیا ظاہر ہے کہ یہ زمانہ ترکوں کے کامل تسلط اور خاندان عبدالوہاب کی عبرت انگیز ہزیمت اور شکست کا تھا۔

اور جبکہ اہل حجاز کو آج تک نجدیوں سے نفرت ہے تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ۔ ترکوں کے کامل تسلط اور عربوں کے آزاد دور میں نجدیوں کی تبلیغ یا اُن کے سلسلہ کی ترویج سرزمین حجاز میں ہو سکے۔

مگر کہنے والوں کی زبان کون بند کر سکتا ہے۔

یہی پروپاگنڈا کیا گیا کہ حضرت سید صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب شہید۔ عبدالوہاب کے پیرو ہیں اور حضرت سید صاحب کی مذکورۂ بالا اصلاحات کو دعوے کی دلیل قرار دیا گیا۔

سادہ لوح اور پھر شر پسند متمرد طبیعتوں کے لئے بہانہ ہاتھ آ گیا انہوں نے خفیہ طور پر ایک شب خندرس کوٹنے کے لئے مقرر کر لی خندرس اگرچہ جوار کو کہتے ہیں۔ مگر اپنی اصطلاح میں اس لفظ کو غازیوں اور مجاہدین کے قتل کے لئے مقرر کیا گیا۔

ایک شام کو مجاہدین نے دیکھا کہ پہاڑیوں پر اور قریہ بقریہ اونچے اونچے مکانات پر آگ جلائی جارہی ہے۔ اور خوب ڈھول ڈھماکا ۔ شور و شغب ہے اور خوب خوشیاں منائی جارہی ہیں۔

مجاہدین نے اپنے اپنے مواضعات کے لوگوں سے سبب دریافت کیا۔ تو بتایا گیا کہ ہم نے طے کیا ہے کہ آج شب کو خندروس کو ٹائیں تاکہ کل کو عشرا ادا کیا جاسکے۔ مجاہدین مطمئن ہو کر اپنے قاعدہ کے بموجب نماز اور تسبیح میں مشغول ہو گئے۔ لیکن جب عین عشا کی نماز میں یا نصف شب کو سوتے ہوئے یا صبح کی نماز کے وقت اُن کے گلوں پر غداری سے چھُری پھیری گئی۔ تب معلوم ہوا کہ "خندروس" سے یہ مجاہدین ہی مراد تھے۔

آگ دی صیاد نے جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

ان غریب الوطن مجاہدین کے قتل میں انتہائی سنگدلی سے کام لیا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو کلمۃ اللہ کو بلند کرنے وطن عزیز کو اغیار کے نرغہ سے نجات دلانے۔ ملت اور قوم کو حریت بخشنے کے لئے اپنے گھروں سے نکلے تھے۔

عزیز بچوں کو بلکتے ہوئے۔ عزیز بیویوں کو روتے ہوئے اور مشفق ماں باپ کو دیدار کے لئے ترستا چھوڑ کر سینکڑوں میل کے جنگلات اور پہاڑیوں کو طے کر کے اس جگہ پہنچے تھے۔ تاکہ سرحدی بھائیوں سے اتفاق کر کے اپنے قومی اور ملی نظریہ کو کامیاب بنائیں۔

مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ وہی بھائی خونخوار دشمن بن کر اس طرح قتل

اور ذبح کریں گے کہ رہتی دنیا تک اس خونیں تاریخ پر خون کے آنسو بہائے جائیں گے۔ اور ہر محب قوم اور بہی خواہ ملت کا دل ہمیشہ ہمیشہ نفریں بھیجتا رہیگا۔

یہ قتل ایک ہی شب میں مختلف اوقات میں کیا گیا۔ کہیں عشاء کی نماز کے وقت، جبکہ پاکباز مجاہدین رب ذوالجلال کی بارگاہ میں سربسجود تھے۔ کہیں نصف رات کو جب کہ دن بھر کے تھکے ماندے تکان دور کرنے کے لئے جھونپڑی کے ایک کنارہ میں پڑ کر سو گئے تھے۔ اور کہیں صبح کی نماز کے وقت جب کہ صبح کے سہانے وقت نے ہر گل کو خنداں اور ہر عندلیب کو نغمہ سنج بنا رکھا تھا اور یہ خدا کے پاک بندے خالق کے ذکر میں مشغول تھے

انا للہ وانا الیہ راجعون

بیان کیا جاتا ہے کہ سید صاحب رحمہ کے پاس اس سازش کے متعلق کچھ اطلاعات پہلے سے پہنچ چکی تھیں۔ مگر باشندگان علاقہ سمہ کے معتقدانہ تعلقات نے آپ کو باور کرنے کا موقع نہ دیا۔ اور جب کہ قاضی پنشاور سید مظہر علی کی شہادت کی خبر پہنچی تو آپ کو اُن اطلاعات کی تصدیق ہوئی چنانچہ آپ نے تمام عمال اور گماشتوں کو پنجتار میں طلب فرمالیا۔ مگر حضرت سید صاحب کے پیچھے بھی کچھ بد طینت لگے ہوئے تھے۔ جنہوں نے لیڈران سازش کو اطلاع کر دی۔ چنانچہ سازش کے لیڈروں نے تاریخ معینہ سے تین چار روز پیشتر کی تاریخ مقرر کرکے احکام پہنچنے سے پہلے ہی اپنا کام کر لیا۔

حضرت سید صاحب خونی غداری کے بعد

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

یہ بتانا مشکل ہے کہ اُس وقت سید صاحب کا کیا حال ہو گیا ہو گا۔ جب کہ اُس گلشن کی تباہی کی خبریں پہنچیں۔ جس کو سالہا سال کی کاوش۔ سیکڑوں مصیبتوں۔ ہزاروں قربانیوں اور صدہا مجاہدین کے مقدس خون سے سینچا گیا تھا۔ جس کے لیے تمام ہندوستان نے اپنے جگر پارے اوگل دیے تھے۔ جن کو مہینوں اور برسوں کے دورہ میں چن چن کر اس گوشہ میں فراہم کیا گیا تھا۔

بہر حال سید صاحب نے ارادہ فرما لیا کہ اب بدنصیب سرزمین سے ہجرت کی جائے۔ جس قدر مجاہدین دارالخلافہ میں موجود تھے سب کو جمع کر کے رقت آمیز لہجہ میں ایک وعظ فرمایا۔ کہ

میں اب اس سرزمین کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ نہیں بتا سکتا کہ کہاں جاؤں گا۔ اور کس قدر مصیبتیں برداشت کروں گا آپ حضرات مصائب برداشت کرتے کرتے گھبرا گئے ہوں گے۔ اب میں آپ حضرات کو رخصت دیتا ہوں۔ آپ مجھے اجازت دیجیے۔

لیکن سید صاحب کے ہندوستانی رفقا وہ نہ تھے جو کسی حالت میں بھی

سید صاحب کا ساتھ چھوڑ دیں۔ انہوں نے متفقہ طور پر یہی عرض کیا:

جو دامن مبارک ہمارے ہاتھوں میں ہے ممکن نہیں کہ دنیا
کی کوئی مصیبت اُس کو چھوڑا دے۔ ہم سب آپ کے ہیں
آپ کے ساتھ رہیں گے۔ اور آپ ہی کے قدموں پر نثار ہونگے

چنانچہ سید صاحب نے دونوں توپوں کو جو درانیوں سے حاصل کی تھیں۔ ایک محفوظ مقام پر دفن کرا دیا۔ اور فاضل سامان اور آلات حرب کو سید رسول صاحب ساکن نواکٹی کو امانتاً سپرد کر دیا۔ اور کشمیر کی جانب کوچ کا حکم دیا۔

مگر چونکہ کشمیر کی سیدھی راہ میں پکھلی سے گذرنا پڑتا تھا۔ جہاں پایندخاں کا تسلط تھا۔ اور یقین تھا کہ وہ اس نازک وقت میں ضرور مزاحمت کریگا۔ لہٰذا آپ نے سلسلہ کوہ کے بیچ میں کنگلئی۔ بزدھیری۔ اور کاپل کرام وغیرہ سے گذر کر کشمیر پہنچنے کا قصد کیا۔ علاقہ سمہ کے نیک سیرت حضرات نے جو سید صاحب کے مخلص جاں نثار تھے۔ بہت کچھ معذرت کی اور یہی درخواست کی کہ سید صاحب پنجتار ہی قیام فرمائیں۔ مگر ایک سمجھدار کے لئے کب جائز تھا جو ایسی قوم پر اعتماد کرے جس نے سالہا سال کی عقیدتمندی کو ایک دم میں نذر وحشت کر دیا۔

رجب ۱۲۴۶ھ میں سید صاحب اپنے رفقاء کے ساتھ کشمیر کی جانب روانہ ہوئے۔ پنجتار اور سمہ کے مخلص عقیدتمند کئی منزل تک پہنچانے کے لئے گئے ؛

خونِ بے گناہ کا قدرتی انتقام

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

انسان غافل ہو جاتا ہے۔ مگر قدرت غافل نہیں ہوتی۔ اس کا پوشیدہ ہاتھ خونِ مظلوم کا انتقام لیتا ہے۔ اور ضرور لیتا ہے۔

سید صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے علاقہ سمہ سے پشت پھیری کہ سکھ فوجوں نے بھیڑیوں اور چیونٹیوں کی طرح اس علاقہ کا رخ کیا۔ مصنف سوانح احمدی کا بیان ہے کہ

لشکر خالصہ کے مسلمان اور خود سکھ۔ اہل سمہ کی غداری کی خبر اور غازیوں کے قتل ناحق سے ایسے غصہ اور جوش میں تھے کہ ہزار ہا باشندگان سمہ کو قتل کر گئے دیہات میں آگ لگا دی۔ آباد آبادیوں کو خاک سیاہ کر دیا۔ اور ان کے بچوں۔ عورتوں اور مال ومویشی کو پکڑ کر لا ہور لے گئے۔

اس خونریزی میں لشکر خالصہ نے ہلاکو۔ چنگیز خاں اور تیمور لنگ کو بھی مات کر دیا۔ قتل اہل سمہ کے وقت ہر سپاہی کی زبان پر یہ تھا کہ "جس قوم نے اپنے پیر و مرشد اور امام کے ساتھ غداری کی وہ کس کے ساتھ وفاداری کر سکتی ہے۔"

مورخین کا بیان ہے کہ ایک ایک غازی کے عوض اس قدرتی انتقام میں دس دس پٹھان تلوار کے گھاٹ اتارے گئے۔ اور شہدائے کربلا کی طرح

دنیا ہی میں اس ظلم بے پناہ کا انتقام لے لیا گیا۔

روایت ہے کہ جب لشکر خالصہ علاقہ ہمہ میں داخل ہوا تو ہمہ [illegible] اہل ہمہ حضرت سید صاحب کی تلاش میں نکلے [illegible] (راج دواری) مقام [illegible] یہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

سید صاحب نے اُن کی درخواست کے جواب میں ایک الہامی جملہ ارشاد فرمایا:

"علاقہ ہمہ خاک سیاہ ہو چکا۔ تم اپنے سوختہ گھروں کی جاکر مرمت کر لو۔"

یہاں سے یہ لوگ واپس پہنچے تو الہام کی تصدیق کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا۔

سکھوں سے دوبارہ جنگ

درہ بھوگر منگ کا حملہ عقیدتمندان ہمہ کی غداری اور مجاہدین کی ہولناک شہادت سے خیال ہو سکتا تھا۔ "اب سید صاحب سپاہی جہاد سے دست بردار ہو جائیں گے"

مگر قدرت نے سید صاحب کو وہ دل نہ دیا تھا جو زمانہ کی بوقلمونی سے متاثر ہو۔ یا کوئی زہرہ گداز حادثہ اُس کو حوصلہ مندی اور شوق جہاد سے باز رکھ سکے۔

چنانچہ سید صاحب نے (راج دواری) علاقہ کاغان (کشمیر) پہنچکر مجاہدین

کی از سر نو ترتیب فرمائی - برف باری کا موسم شروع ہو گیا تھا - اس لئے
غازیوں نے چھوٹے چھوٹے جھونپڑے سر چھپانے کے لئے بنا لئے -
۷ شعبان ۱۲۴۶ھ کو سید صاحب کی صاحبزادی ہاجرہ اس مقام پر
تولد ہوئیں -

سامان سکونت سے ہنوز پوری طرح فراغت نہ ہوئی تھی - کہ
چار سو مجاہدین کا دستہ زیر قیادت مولانا اسمٰعیل صاحب شہید اور زیر
نیابت مولانا خیر الدین صاحب شیر کوٹی پیچون اور درہ بھوگڑمنگ کی
طرف روانہ کر دیا - جہاں سکھوں کی فوج رہا کرتی تھی - اور ان دنوں راجہ
شیر سنگھ بیس ہزار فوج لیکر مالگذاری وصول کرنے کے لئے اس نواح
میں خیمے ڈالے ہوئے تھا -

مجاہدین کا شبخون کامیاب رہا - مال غنیمت بھی بہت کافی ہاتھ لگا
اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس نواح کے باشندگان نے سکھوں
کو مالگذاری دینے سے انکار کر کے ساری مالگذاری مجاہدین کی خدمت
میں پیش کر دی - ایک نعمت غیر مترقبہ تھی -

مقتل پر قبضہ

جنگ مظفر آباد اور بالاکوٹ

سچوں اور درہ بھوگڑ منگ سے آگے بڑھکر مولانا شہید نے بالاکوٹ پر قبضہ کر لیا۔ جہاں چند دنوں بعد خون شہادت سے رنگے گئے کپڑے پہنکر ہمیشہ کے لیئے ایک راحت گاہ تیار کرنی تھی۔ ان ایام میں راجہ شیر سنگھ سلطان نجف خاں رئیس مظفر آباد کی ہمراہ پشاور گیا ہوا تھا۔ اور مظفر آباد جو اُس نواح کا ڈویژن اور سکھ فوج کا ہیڈ کوارٹر تھا سرداروں سے خالی تھا۔

سلطان زبردست خاں۔ اور راجہ مظفر خاں رفقائے مجاہدین نے مشورہ دیا کہ مظفر آباد پر قبضہ کرنے کا بہترین موقعہ ہے۔ چنانچہ خیرالدین صاحب۔ ملا قطب الدین صاحب ننگرہاری اور منصور خاں صاحب قندھاری کو مولانا شہید نے مجاہدین کا ایک دستہ دیکر مظفر آباد بھیج دیا۔ جنہوں نے ایک سخت مزاحمت اور خونریز جنگ کے بعد مظفر آباد پر قبضہ کر لیا۔ سکھ چھاؤنی چھوڑ کر بھاگ گئے اور ایک گڑھی میں جا کر پناہ گزیں ہوگئے۔

سید صاحب نے بھی اب حرکت شروع کی مولانا محمد قاسم صاحب پانی پتی اور شیخ حسن علی صاحب وغیرہ کو ایک دستہ کے ساتھ۔ راج دواری چھوٹا۔ خود باقی مجاہدین کو ہمراہ لیکر سچون اور بھوگڑ منگ میں آکر قیام فرمایا۔

راجہ شیر سنگھ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو فوراً پشاور سے واپس آکر گڑھی حبیب اللہ میں اقامت گزیں ہوا جو مظفر آباد اور بالاکوٹ کے درمیان میں تھی۔

مظفر آباد پر اگرچہ قبضہ ہو گیا تھا۔ مگر مجاہدین کے یہاں رہنے کے باعث دردھو کرمنگ اور سچون کا محاذ کمزور ہو گیا تھا۔ چنانچہ مجاہدین کو مظفر آباد سے بھوکر منگ طلب کر لیا گیا جب مظفر آباد مجاہدین سے خالی ہو گیا تو شیر سنگھ نے بھی مظفر آباد کا ارادہ ترک کر کے بھوکر منگ کی جانب کوچ کر دیا۔

شیر سنگھ کے اس کوچ کی خبر پا کر سید صاحب نے مولانا اسمٰعیل صاحب کو بھی بالاکوٹ سے سچون بھی طلب فرمالیا۔ مولانا شہید بالاکوٹ پر سردار حبیب اللہ خاں صاحب کو کچھ مجاہدین کے ساتھ مامور فرما کر باقی مجاہدین کی ہمراہ بھوکر منگ پہنچ گئے۔

جب شیر سنگھ کو معلوم ہوا کہ بھوکر منگ کا محاذ مضبوط کر لیا گیا۔ تو وہ فوراً بالاکوٹ کی جانب یورش کرتا ہوا بڑھا۔

سردار حبیب اللہ خاں نے اس کی آمد کی خبر سنکر سید صاحب سے امداد طلب کی۔

اس وقت شیر سنگھ کا لشکر بالاکوٹ سے چند میل کے فاصلہ پر رہ گیا تھا۔ سید صاحب نے اطلاع پاتے ہی تھوڑے سے مجاہدین کو بھوکر منگ چھوڑ کر باقی مجاہدین کی ساتھ۔ بالاکوٹ کی جانب بطریق یلغار روانہ ہو گئے۔

جنگ بالاکوٹ

شہادت۔ اور خاتمہ تحریک

سید صاحب مجاہدین کی پوری طاقت کے ساتھ بالاکوٹ پہنچ گئے ہیں۔ بالاکوٹ۔ گویا ایک قدرتی قلعہ ہے۔ جس کو چار دل طرف آدائے (اونچے) اونچے پہاڑوں کی مضبوط دیواروں نے گھیر رکھا ہے۔ صرف ایک جانب ایک پل پر سے گزر کر تنگ گھاٹی کے راستہ سے ایک سڑک لاہور جاتی ہے۔ مگر اس پر ایک گارڈ معین کر دی گئی ہے۔ پہرہ کا انتظام معقول کر دیا گیا ہے۔ ہاں ایک دوسری جانب چور دروازے کے طور پر ایک چھوٹا سا پہاڑی راستہ اور بھی ہے۔ جس کو سلاطین ہند نے نکالا تھا۔ مگر اس پر سب طرف سے اتنے درخت کھڑے ہو گئے ہیں کہ اس راہ سے گذرنا مشکل ہے علاوہ ازیں پہاڑی باشندگان کے سوا کوئی اس راستہ کو جانتا ہی نہیں۔ اس لئے اس کی حفاظت کی طرف زیادہ توجہ بھی نہیں کی گئی۔ صرف ستر آدمی اس طرف مقرر کر دئے گئے ہیں۔

شیر سنگھ اگرچہ یہاں سے صرف دو کوس ہے۔ مگر دشوار گزار راستوں سے گذر کر کامیابی ناممکن تصور کر رہا ہے۔ لہٰذا لاہور کی طرف کوچ کا ارادہ مصمم کر چکا ہے۔ مگر افسوس کہ ہندوستان کی قسمت کا تارہ غروب ہو چکا تھا۔ بدبختی اور ادبار کی وہ تاریکی چھانے والی تھی۔ جس کو ہندوستانیوں کی غداری اور اغراض پرستی عرصہ سے دعوت دے رہی تھی۔

آج بھی ایک بدبخت اغراض کا ایک بقچہ اپنے پہلو میں چھپائے ہوئے شیر سنگھ کے حضور میں حاضر ہوا - اور ذاتی اغراض کی سیکڑوں امنگوں کے ساتھ للچائی ہوئی لگا ہوں - اور مسکراتے ہوئے لبوں سے عرض کیا -

حضور ـــ ایک راستہ ہے - اگر بندہ پروری کا وعدہ ہو - تو میں اس کو بتاؤں - اور اپنی ذمہ داری پر آپ کے لشکر کو پہنچا دوں -

شیر سنگھ جو اس آواز کی تمنا دل میں لئے ہوئے تھا - فوراً چونکا - اچھا ـــ کوئی راستہ ہے - جہاں سے ہماری فوج گذر سکتی ہے - اچھا کچھ سپاہیوں کو لیجا کر اطمینان کرادو -

سکھ سپاہیوں نے جاکر راستہ پہچان لیا - اب کیا تھا - خوشی کی تالیاں پیٹنے لگیں سجے ہو شیر سنگھ کی - وجے ہو --

نہایت خاموشی کے ساتھ ایک مُسلح اور مضبوط دستہ آگے آگے روانہ ہوا - ساری فوج اُس کے پیچھے تھی - اور اسی پہاڑی راستہ کو جس کو دشوار گزار یقین کر کے توجہ میں نہیں لایا گیا تھا اور جس پر صرف ستر آدمی احتیاطاً مقرر کردئے گئے تھے - طے کرتا ہوا - مجاہدین کے سر پر جا پہنچا - اور مجاہدین کو جام شہادت سے سرشار کرتے ہوئے - وسط بالاکوٹ کے قریب پہنچ گیا - جہاں سید صاحب اور دیگر حضرات موجود تھے -

اب بیس ہزار مسلح فوج نے ایک محصور مقام پر ہزار بارہ سو کی مٹھی بھر جماعت کو اس طرح گھیر لیا تھا کہ نشیبی علاقہ میں یہ مجاہدین تھے - اور بلندی کی جانب سب طرف سے یہ خونخوار بھیڑیے اُن کو گھیرے ہوئے تھے - تاہم تحفظ کا

کا انتظام کیا گیا۔ جلدی جلدی ایک مسجد کی چار دیواری کو تختوں وغیرہ سے کسی حد تک گھیر گھار کر مورچہ بنایا گیا۔ مقابلہ شروع ہوا۔ مگر سکھ فوج کی پیش قدمی کو نہ روکا جا سکا۔ آخر دست بدست جنگ شروع ہوئی۔

بدقسمتی سے دونوں فریق ایک ایسے میدان میں گھر ے ہوئے تھے کہ جو بھی شکست کھاتا۔ اس کے لیے بچ کر نکلنا ناممکن تھا۔ البتہ سکھوں کی پشت پر بھاری جمعیت پہاڑیوں سے فیر کرنے والی بھی تھی۔ جو گولیوں کی بارش برسا رہی تھی۔

فریقین کے گھر جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں فوجیں انتہائی بے جگری کے ساتھ۔ میدان میں ڈٹ گئیں۔

ممکن تھا۔ گذشتہ معرکوں کی طرح اس کارزار میں بھی مجاہدین سکھوں کے پرخچے اڑا ڈالتے ۔۔ مگر پہاڑیوں کے اوپر سے جو گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ انہوں نے مجاہدین کے لئے جدوجہد کو ممکن بنا دیا تھا۔

تاہم جنگ کی۔ بہت قوت کی جنگ کی۔ ایک ایک نے دسیوں کو ختم کیا مگر تاکے۔

سید صاحب رحمہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ غنیم کی فوج میں گھس گئے۔ آپ کے پیچھے پیچھے۔ مولانا اسمٰعیل صاحب شہید۔ ارباب بہرام خاں شہید اور دوسرے جاں نثار مجاہدین بھی سکھوں کی فوج میں گھس پڑے۔ اور اس قدر گھمسان جنگ ہوئی کہ مقتولین کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ سر کہیں۔ دھڑ کہیں اور وہ بھی گھوڑوں کی ٹاپوں میں کچل کچل کر پارہ پارہ ہوئے۔

کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی سخت جنگ چشم فلک نے کبھی نہیں دیکھی تھی اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ سید صاحب شہید ہوئے تو سر کہیں تھا۔ اور جسم مبارک کہیں۔ اور ایسا مظلوم۔ جور اعدا کا ایسا ستم زدہ۔ ایسا تشنۂ مشق اور ایسا ستایا ہوا۔ کہ خود رفقا بھی نہ پہچان سکے۔

حتیٰ کہ مولانا جعفر علی صاحب نقوی جو باڈی گاڈ تھے۔ اور کند ھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے لکھتے ہیں۔

جناب حضرت امیر المومنین رح در میان جماعت از نظر من غائب شدند۔

بہر حال سید صاحب جیسے عاشق کی تو تمنا بر آئی۔ اُن کے رگ و پے نے معشوق حقیقی کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو کر یہی پکارا۔

فزت ورب الکعبۃ رب کعبہ کی قسم کہ میں کامیاب ہو گیا۔

مگر سید کے عاشقوں کو یہ دھوکا ضرور ہو گیا کہ " سید صاحب زندہ ہیں اور کرامت کے طور پر غائب ہو گئے۔ اور پھر قسم قسم کی روایتیں گھڑی گئیں

مولانا اسمٰعیل صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے بھی اسی محشر نما معرکہ میں شہید کا خطاب۔ حاصل کر کے سالہا سال کی وہ تمنا پوری کی۔ جس کی پاک آرزو میں غنچہ دل اسی وقت سے گل لالہ بن گیا تھا۔ جب کہ ننھا سا تھا۔

تاریخ شہادت ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق مئی ۱۸۳۱ء روز جمعہ وقت جمعہ۔ شہادت کے وقت سید صاحب کی عمر ۴۶ سال تھی۔ اور شاہ شہید کی عمر ۵۳ سال۔ رحمہم اللہ وقدس اللہ سرہم۔

ہ حیات طیبہ صفحہ ۳۱۲ ۱۲

شہادت کے بعد

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

مجاہدین کی بڑی جماعت وہیں شہید ہو گئی۔ اور جب میدان جنگ میں سید صاحب نہ پائے گئے تو سکھوں نے فتح کے نقارے بجائے۔ اطمینان سے بالاکوٹ میں قیام کیا۔ دو تین روز سستا لینے کے بعد جب اپنے مُردوں سے فارغ ہوئے تو سید صاحب کے جنازہ کی تلاش شروع کی۔ مگر پہچاننا مشکل تھا۔ تو اُس پاس کے دیہات میں کسی پہچاننے والے کو تلاش کرنا شروع کیا۔ شیخ وزیر گولہ انداز کے ۸-۹ سالہ لڑکے نے کہا کہ وہ پہچانتا ہے۔ اُس کو پکڑ کر لائے۔ اُس نے ایک نعش کو پہچان کر بتایا کہ یہی امیرالمومنین کی نعش ہے۔ چنانچہ راجہ شیر سنگھ نے اُسپر دوشالہ ڈلوا کر اپنی فوج کے مسلمانوں اور اس اطراف کے رہنے والے مسلمانوں سے جنازہ کی نماز پڑھوا کر بڑے اعزاز و اکرام سے اُس کو دفن کرایا۔

جنگ بالاکوٹ کے بعد میدان جنگ کے بچے ہوئے مجاہد جو متفرق مقامات پر معین تھے۔ وہ سب تقریباً سات سو تھے۔ مگر کسی ایک سردار پر اتفاق نہ ہو سکا۔ شیخ ولی محمد صاحب پھلتی سرداری کے قابل تھے۔ وہ سید صاحب کے اہل و عیال کو لیکر ہندوستان تشریف لے آئے۔ باقی مجاہدین بھی اسی طرح منتشر ہو گئے۔

البتہ تقریباً ڈیڑھ سو حضرات وہ تھے جنہوں نے وطن آنا پسند نہ کیا۔ ان حضرات نے مولانا نصیر الدین صاحب کو اپنا امیہ منتخب کرلیا۔ اور سید اکبر صاحب رح کے پاس "ستھانہ" میں اقامت گزیں ہو گئے۔ ان کے پسماندگان کا ایک سلسلہ ابتک اس علاقہ میں موجود ہے۔ ان حضرات کو مجاہد ہی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ فقیرانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور موقعہ بموقعہ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

حضرت سید صاحب کی شہادت سے تقریباً تیس سال بعد ۱۸۶۲ء میں انہیں مجاہدین نے پھر اقدام کیا۔ مگر پانچ سال پیشتر ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے انگریز کے قدم مضبوطی سے جما دئے تھے۔ چنانچہ "لارڈ الگن" وائسرائے ہند نے پوری قوت سے مقابلہ کرکے مجاہدین کو شکست دے دی۔

اس جنگ کو تاریخ کی کتابوں میں "وہابیوں کی جنگ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مزید تذکرہ آگے آئیگا۔ (انشاء اللہ)

نذرِ عقیدت

جنگ بالاکوٹ کا شہادت نامہ آپ نے پڑھا - یقیناً معرکہ کربلا کا نقشہ آپ کے سامنے آگیا ہوگا - بظاہر یہ عظیم الشان قربانی - ناکامی - اور حسرت و یاس پر ختم ہوئی - مگر خدا کے ہاں کامیابی اور ناکامی کا سوال نہ ہوگا - بارگاہ رب العزت میں ان شہیدوں کی وہ قربانیاں مقبول ہوں گی - جوان حضرات نے اُس کا نام بلند کرنے کے لئے پیش کیں

العظمۃ للہ - اس مقدس جماعت کی جفاکشی - بذات خود حیرت انگیز ہے - جو ایک مفکر کو لرز براندام کر دیتی ہے - یہ مجاہدین کی مقدس اور باخدا جماعت - اس مقدس جہاد کے لئے جو راستہ اختیار کرتی ہے وہ خود فوق العادت جرأت اور عزیمت کی بے نظیر مثال ہے -

ذرا رائے بریلی کا نقشہ ذہن میں جما کر اس طویل سفر کا تصور فرمائیے - رائے بریلی سے ٹونک - اجمیر شریف - دہلی اور پھر دوآبہ کا گشت کرتے ہوئے سہارنپور سے پانی پت - کرنال - تھانیسر - مالیر کوٹلہ - ممدوٹ - بھاولپور - حیدرآباد سندھ - خان گڑھ - درہ ڈھاڈر - درہ بولان وغیرہ سے ہوتے ہوئے بشین پہنچے - وہاں سے خراساں - پھر قندھار - اور قندھار سے کابل ہوتے ہوئے درۂ خیبر کے راستہ سے پشاور آئے - اور پشاور سے ہشت نگر وغیرہ بہرحال ہزاروں میل کا دشوار گذار راستہ ہے - جس کا بیشتر حصہ پہاڑی - جس کا ایک میل بھی طے کرنا مشکل ہے -

آج اگر ہمارے لیڈر تھرڈ کلاس میں سفر کر لیتے ہیں تو اپنی قربانی کے بلند بانگ دعوے سے چاہتے ہیں کہ فضاء آسمانی کو گونجا دیں۔ اور ساری دنیا سے خراج تحسین حاصل کریں۔

لیکن قربانی یہ ہے کہ ایک مقدس جماعت۔ بے یار و مددگار۔ چلتی ہے۔ نہ اُس کے پاس جنگی سامان قابل ذکر ہے۔ نہ سامان رسد بقدر ضرورت۔ فاقوں پر فاقے ہیں۔ رنگتیں زرد۔ پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے۔ چہرے گرمی اور تپش سے تمتمائے ہوئے۔ مگر نظر مقصد پر جمی ہوئی ہے۔ اولاد کو چھوڑا۔ اہل و عیال کو خیرباد کہا۔ وطن عزیز کے عیش و آرام پر لات ماری۔ ایک مقصد سامنے ہے اور اُس پر سب کچھ قربان۔

سبحان اللہ۔ والعظمۃ للہ۔ قربانی یہی ہے۔ فداکاری اسی کو کہتے ہیں!!

ہر دو شہید اعظم اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ اے پاکباز شہیدو۔ تمہاری پاک روحوں پر فردوس بریں کی نعمتیں قربان ہوں۔ تمہارا خدا تم سے راضی ہو۔ دودمان ولی اللہ کے محبوب فرزندو! تم پر سلام۔ علماء امت اور مجاہدین ملت کے مبارک رہنماؤ تم پر سلام۔ رسم قربانی کے زندہ کرنے والو تم کو

مبارک باد مبارکباد مبارک باد

مقصود جہاد

ایثار اور قربانی۔ جد وجہد اور فدایت کی ایک معصوم تاریخ آپ پڑھ چکے۔ چشم فلک سے قسم دیکر پوچھو۔ کیا عہد صحابہ اور تابعین کے علاوہ کہیں زمین کے سینے پر کوئی ایسی جماعت اس نے دیکھی؟

اولاد آدم کی تاریخ کے اوراق پلٹو۔ سیرت مقدسہ کے علاوہ کوئی سطر بھی آپ کو اس قسم کی روایت پیش کر سکتی ہے۔

جو کچھ لکھا بہت مختصر۔ افسوس کہ رسالہ کا کشکول اس سے زیادہ کا متحمل نہیں۔ بہر حال سوال یہ ہے کہ اس تمام جد وجہد۔ ریاضت۔ قربانی۔ جفاکشی ترک وطن۔ ترک دولت۔ ترک احباب۔ ترک اقارب کا مقصد کیا تھا۔

دنیا کی خونین تاریخ میں قوموں اور حکومتوں کے بننے اور بگڑنے کی انسانی خون سے رنگی ہوئی سیکڑوں داستانیں موجود ہیں۔ بلکہ انہیں کے مجموعہ کو آج کل تاریخ کہا جا رہا ہے۔

اس گندہ "تاریخ" نے آج ہمارے دماغوں کو اس درجہ ماؤف کر دیا ہے۔ کہ جب بھی جنگ کا نام ہماری زبان پر آتا ہے انہیں قومی ہنگاموں کا تخیل بندھ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ ایک جماعت اپنی قربانیوں یا اپنی قوت کے بل بوتے پر خواہش کر رہی ہے کہ۔

تخت و تاج کی وہ مالک ہو۔ دولت کے انبار اس کے عشرت کدہ کے گوشوں میں بھرے ہوئے ہوں۔ لاکھوں بندگان خدا کی گردنیں اپنے

خالق کی تعظیم و تکریم کے بجائے اس جماعت کے اقتدار کے سامنے خم ہوں۔
اور اس کے آستانۂ جاہ و جلال پر سجدہ ریز ہوں۔

لمن الملك کی صدا اس جماعت کے بچہ بچہ کی زبان پر ہو۔

کوٹھیاں اور بنگلے، گلشن اور باغیچے، بہترین سواریاں۔ اعلیٰ قسم کا ساز و سامان اُس کے قبضہ میں ہو۔ گویا اس جماعت کو (معاذ اللہ) دنیا کی خدائی حاصل ہو۔

مگر کیا اس جماعت کا بھی مقصد یہی ہو سکتا ہے جو اسلام کے نام پر قربان ہونے کے لئے گھر سے نکلی ہو۔

معاذ اللہ۔ ہرگز نہیں۔

حرام ہے کہ کوئی جماعت اس لئے جنگ کرے کہ اس کا بول بالا ہو۔ اس کی جے ہو۔ مسلمان کی جنگ صرف اس لئے ہوتی ہے کہ تمام انسانوں کے پیدا کرنے والے کا۔ تمام مخلوق کے خالق کا۔ اور سارے جہانوں کے پروردگار کا بول بالا ہو۔

لتكون كلمة الله هي العليا۔ صرف اللہ ہی کا کلمہ بلند ہو۔

اسلام کبھی بھی عجمی یا عربی۔ کالے یا گورے کی تقسیم گوارا کر کے جائز نہیں قرار دیتا کہ ایک جماعت کے پاس دولت کے انبار رہوں۔ اور دوسری جماعت اس کے سامنے بھوکی مرتی رہے۔ ایک جماعت دولت سرمایہ کے سر پر بیٹھ کر رب اعلیٰ کی حیثیت حاصل کرے۔ اور دوسری جماعت فاقہ و افلاس کے تڑپانے اور بے چین کرنے والے ہاتھوں سے آ کر اپنے ننھے ننھے بچوں کی بھوک بے کسی اور

بیماریوں سے مجبور ہو کر۔ اُس کے اقتدار اعلیٰ کے سامنے سر بسجود ہو۔

فرعون کا سب سے بڑا جرم کیا تھا ــــ یہی کہ

علا فی الارض۔ وجعل	ملک میں بڑا بنگیا اور (پھر اپنا اقتدار اعلیٰ کو برقرار رکھنے
اھلھا شیعا۔ یستضعف	کے لئے) اہل ملک کے جتھے بنائے۔ ایک جماعت کو کمزور
طائفۃ منھم یذبح ابناءھم	کرنے لگا اور پھر انقلاب کے خطرے سے محفوظ رہنے
ویستحیی نساءھم۔	کے لئے اُسکے لڑکوں کو ذبح کرنے لگا اور عورتوں کو
	زندہ رکھنے لگا (تاکہ اُسکی عیش پرستی کیلئے ایک جماعت
	تیار ہو جائے)

خدا کی پناہ۔ اسلام سے بڑھکر انسانی شرافت اور احترام کا محافظ کون ہو سکتا ہے۔ جس کو یہ بھی گوارا نہیں کہ نظام حکومت کے سلسلہ میں ملک یا ملوکیت کا نام ہی آ جائے۔

حامل شریعت علیہ الصلوۃ والسلام نے اعلان کر دیا تھا۔

اخنع اسم الی اللہ یوم القیامۃ	بدترین نام خدا کے ہاں قیامت کے
رجل تسمی ملک الاملاک لا	روز یہ ہے کہ کوئی انسان اپنے لئے
ملک الا اللہ۔ قال سفیان شاھنشاہ	شاہنشاہیت کا لقب تجویز کرے
(شیخین وابی داؤد والترمذی) جمع الفوائد ص۱۶۳ج۲	ملک صرف اللہ کا ہے۔

یہ صرف اعلان ہی نہیں تھا۔ بلکہ ہر ایک فعل میں اس کا مظاہرہ موجود تھا جس وقت یہی حامل شریعت دشمنوں کی ایک بہت بڑی فوج سے مقابلہ کرنے

کے لئے ایک خندق کھود رہا تھا۔ تو دنیا نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا کہ فوج کے دوسرے مجاہدین کی طرح یہ بھی خندق کھودنے اور پتھر ڈھونے میں مصروف تھا (صلے اللہ علیہ وسلم)

جس وقت عرب کی سب سے بڑی قوت کا ذمہ دار اعلیٰ بن کر فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہو رہا تھا۔ تو جنگی شدت یکسر کافور تھی۔ اور اُس کے برعکس اُن ہی دشمنوں کے حق میں سراسر رحم تھا۔ جو ہمیشہ خون کے پیاسے رہے تھے۔ اور اپنے بے نظیر ظلم وستم میں تمام دنیا کی مثالوں کو شکست دیتے رہے تھے۔

اور جب اس موقعہ پر دس ہزار سرفروش مجاہدین کی منظم اور مسلح فوج دیکھ کر ابوسفیان نے حضرت عباس سے کہا تھا

اصبح ابن اخیک ملکاً عظیما　　تیرا بھتیجا تو بہت بڑا بادشاہ ہوگیا

تو ملوکیت سے عام نفرت کا یہ عالم تھا کہ حضرت عباس نے بات کاٹ کر فوراً ہی جواب دیا تھا

لیس بملك ولکنھا النبوۃ　　بادشاہت نہیں۔ سراسر نبوت ہے[1]

عرب کی سرزمین پر اللہ والوں کی یہ تنظیم۔ یہ شوکت وحشمت ایک عظیم الشان انقلاب تھا۔ جس نے ساری دنیا کو حیرت زدہ کردیا تھا۔

مکہ کے ناعاقبت اندیش اور فریب خوردہ رؤسا کی کیا مجال تھی کہ وہ اس کے سامنے سر اُٹھا سکتے۔ مجبوراً سر اطاعت خم کردیا۔ اور پاک بندوں کی

---

[1] جمع الفوائد ص ۳۳ ج ۲

یہ فوج فاتح بنکر مکہ معظمہ میں داخل ہونے لگی۔ مگر اس شان سے کہ قائد اعظم
کی گردن اپنے رب ذوالجلال کے سامنے تواضع سے جھکی ہوئی تھی۔ اور
عاجزی و انکسار کا یہ عالم تھا کہ عمامہ کی کور جھکتے جھکتے اونٹ کے ہودے پر آ لگی تھی
اور اس کے بعد جب جان فروشوں کا یہ لشکر مکہ پر پوری طرح قابض ہو چکا
اور حرم اطہر میں جشن فتح یا دربار عام کے طور پر مجاہدین اور اہل مکہ کا اجتماع
ہوا۔ تو انسانیت کے اس مربی اعظم نے خانہ کعبہ کے دونوں بازو گھٹنوں پر ہاتھ
رکھ کر[1] جو تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا اس کا ہر ایک حرف اس قابل ہے کہ سونے
کی تختیوں پر ہیرے اور جواہر سے مرصع کیا جائے۔ سلسلہ کلام کی مناسبت
سے اس کے چند جملے یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

ان الله يقول يا ايها الناس
انا خلقناكم من ذكر وانثى
وجعلناكم شعوبا وقبائل لتعارفوا
ان اكرمكم عند الله اتقاكم
فليس لعربي على عجمي فضل
ولا لعجمي على عربي فضل و
لا لاسود على ابيض فضل ولا
لابيض على اسود فضل الا
بالتقوى

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اے انسانو ہم نے
تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور
تمہارے گروہ اور قبیلے اس لئے بنا دیے کہ
آپس میں ایک دوسرے کا تعارف کر سکو (پہچانے
میں سہولت رہے) بلاشبہ خدا کے نزدیک
تم میں سب سے زیادہ عزت و کرامت کا وہی مستحق
ہے جو سب سے زیادہ متقی اور خداوندی احکام
کا سب سے زیادہ پابند ہو۔ لہٰذا عربی کو عجمی پر
یا عجمی کو عربی پر۔ یا کالے کو گورے پر یا گورے
کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ جو کچھ فضیلت

ہے وہ صرف تقوے کے سبب یعنی قانونوں کی پابندی کی

[1] سیرت ابن ہشام ص ۳۱ ج ۲

(پھر اپنے خاص قبیلہ کو خطاب ہوتا ہے)

برادران قریش! ایسا ہرگز نہ ہو کہ تم قیامت کے دن دنیا کو اپنی گردنوں پر لادے ہوئے لاؤ اور دوسرے آدمی آخرت کو لیکر آئیں میں تمہیں خدا سے بے نیاز نہیں کر سکتا	یا معشر قریش لا تجیئوا بالدنیا تحملونہا علی رقابکم ویجی الناس بالآخرۃ فانی لا اغنی عنکم من اللہ شیئاً

اگر دنیا کی کسی جماعت کے لئے۔ کوئی فضل۔ کوئی اقتدار مخصوص ہو سکتا تھا تو وہ قریش کی جماعت تھی۔ جس سے اس نبی ہاشمی کا گوشت و پوست بنا تھا۔ جس کی آغوش میں اس نے پرورش پائی تھی

اور جس کی ایک جماعت نے "جس کو مہاجر" کہتے ہیں۔ (اسلام) اور ساری دنیا سے مقدم ہونے کی وہ عظمت حاصل کی تھی۔ جس کی تعریف رب العالمین نے عرش معلے کے اوپر سے صادر فرمائی تھی۔ مگر دیکھا کس طرح ان کو صاف جواب دیدیا۔

اور کس طرح تقویٰ اور قانون الہی کی پابندی لازم کرتے ہوئے ناجائز سرمایہ داری سے اس جماعت کو روک دیا۔

ملوکیت کی نفرت یہاں تک دلوں میں اتار دی گئی تھی کہ جب حاکم مدینہ طیبہ "مروان بن حکم" نے تقریر کرتے ہوئے کہا "امیر المومنین حضرت معاویہ کو خدا نے ایک بہتر رائے سمجھا دی ہے۔ امیر المومنین نے اپنے صاحبزادے یزید کو خلافت کیلئے نامزد کر دیا ہے" تو فوراً حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے کہا:

أجئتم بها هرقلية - تبايعون لأبنائكم	کیا تم نے خلافت کو "ہرقلیت" (رومی طرز کی شاہنشاہی حکومت) میں ڈھال لیا
(بخاری شریف و فتح الباری ص ۴۳۳ ج ۸)	ہے - اپنی اولاد کی خلافت پر بیعت لینے لگے

مروان نے تاویل کرنی چاہی تو عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے فوراً جواب دیا۔

بل سنة هرقل وقيصر — یہ ابوبکر و عمر کی سنت نہیں یہ ہرقل و قیصر کا دستور ہے

اور پھر جب اس "ہرقلیت" پر عمل درآمد ہونے لگا - یزید نے اپنے والد ماجد کا جانشین بنکر چاہا کہ ملوکانہ اقتدار کے سامنے امت کی گردنیں جھکا دے تو تم نے دیکھا - امت اسلامیہ نے اس وقت کیسا مظاہرہ کیا تھا -

تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا محافظ اور امت اسلامیہ کی صحیح رہنمائی کا سب سے بڑا ذمہ دار اس وقت وہی ہو سکتا تھا جو جگر پارہ رسول اللہ "یعنی فاطمہ زہرا" کا نونہال تھا - جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن "بیٹا" کہکر پکارا تھا چنانچہ وہ "موسیٰ" بن کر فرعونیت کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو گیا۔

زمانہ ناموافق تھا - ابناء زمانہ نے ساتھ چھوڑ دیا تھا -

ملوکیت کے پرچم نئی شان اور نرالی آن بان سے لہرا رہے تھے -

جاہ پرستوں کی بھیڑ اُن کے نیچے پرے باندھے کھڑی تھی -

مگر وہ تنہا - اپنے اہل و عیال عورتوں اور بچوں یعنی دودمان رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کو لیکر میدان میں کود ا- اور مظلومانہ شہادت سے تاریخ ظلم کو رنگین کر دیا-

سانحۂ کربلا کی داستان بارہا سی گئی- ہر سال اس خونی واقعہ کا ماتم کیا جاتا ہے- سینہ کوبی، اشک افشانی- گریہ و بکا- لعنت اور تبرا- سب ہی کچھ ہوتا ہے-

مگر وہ اور دوسرے ملوکیت کا اقتدار- سانحۂ کربلا پر گریہ اور ماتم تو باقی رہ گیا اور اس کا فلسفہ دماغوں سے ایسا نکلا کہ اس کے تصور کو بھی الحاد اور بے دینی قرار دیا جاتا ہے-

تم ہی بتاؤ کیا کبھی دنیا نے ملوکیت کے مقابلہ پر ایسا مظاہرہ کیا تھا- پھر یہ قصہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ختم نہیں ہو گیا بلکہ اس کا سلسلہ بڑھا- سارا حجاز ملوکیت کے مقابلہ پر آگیا-

مگر ملوکیت نے فرعونیت کا وہ مظاہرہ کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا فرعون بھی یقیناً شرمندہ ہو گیا- مدینہ طیبہ میں یزیدی لشکروں نے قتل عام کیا ہزار ہا صحابہ اور ان کی اولاد تہ تیغ کی گئی- اسلام کی مقدس ماؤں اور بہنوں کو ذلیل اور خوار کیا گیا-

اور عام درندگی اور بہیمیت کا وہ مظاہرہ کیا گیا کہ سترہ وقت تک رسول اللہ علیہ وسلم کی مقدس مسجد اذان اور نماز سے خالی رہی-

مگر ملوکیت کی نفرت کچھ اس طرح دلوں میں اتار دی گئی تھی کہ جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آفتاب فیض سے براہ راست

نور حاصل کیا تھا۔ اُن کی گردنیں ملوکیت کے سامنے جھک ہی نہ سکیں۔ چنانچہ اموی حکومت کے مقابلہ میں حجاز مقدس میں خلافت راشدہ کے اصول پر ایک خلافت قائم کرلی گئی جس کی امامت اور قیادت کے لئے سیدنا حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کو منتخب کیا گیا۔ مگر افسوس ملوکیت کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ چنانچہ نو سال بعد عبد الملک بن مروان کے زمانہ میں اس کے گورنر حجاج بن یوسف کا فتنہ بپا ہوا۔

سیدنا حضرت عبد اللہ بن زبیر کو حرم مکہ میں بے جگری کے ساتھ شہید کر دیا گیا۔ نعش مبارک کو باب مکہ پر آویزاں کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ جب ماں بلکہ اس شہید فرزند کی والدہ ماجدہ۔ حضرتؓ اسماءؓ بنت ابی بکر اس طرف سے گزریں اور انہوں نے دیکھا کہ ان کے عزیز فرزند کی ہڈیوں کا پنجر شہر پناہ کے پھاٹک پر لٹکا ہوا ہے۔ تو فرمایا۔ کیا وقت نہیں آیا کہ اس سوار کو اتار لیا جائے حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ شہید ہو چکے۔ حجاج بن یوسف

۱؎ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نواسے تھے یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بڑی بہن حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے صاحبزادے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے والد ماجد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی پھوپی زاد بھائی تھے۔ اس خاندان کے بہت کچھ فضائل احادیث میں وارد ہوئے ہیں اور تاریخ ان کے کارناموں سے بھری ہے۔ حضرت زبیر عشرہ مبشرہ میں سے ہیں جن کو دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی گئی تھی اسلام کے (باقی صفحہ آئندہ پر)

کا تسلط سارے حجاز پر ہو گیا۔ مگر ملوکیت کے برخلاف جو چنگاریاں صحابہ کرام کے قلوب میں دبی ہوئی تھیں وہ اس وقت افسردہ ہوئیں جب اکابر صحابہ کو ایک ایک کرکے طرح طرح کے بہانوں سے دردناک اذیتیں پہنچا پہنچا کر شہید کر دیا گیا۔ مختصر یہ کہ تھوڑی سی تعداد کو مستثنیٰ کرکے صحابہ کرام کی ساری جمعیت اسی ملوکیت کی بھینٹ چڑھ گئی۔

آج سوشلزم۔ بالشویزم وغیرہ کے نظریے دنیا کے سامنے پیش کیے جا رہے ہیں۔ ملوکیت برباد و سرمایہ داری برباد کے نعروں سے فضاء عالم گونج رہی ہے۔ مگر سچ پوچھو تو ۱۳ سو سال پیشتر کی تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔ اور اسی روح کو زندہ کیا جا رہا ہے جس کو اسلام نے پیدا کیا تھا۔

ملوکیت کے بعد دوسری چیز سرمایہ داری ہے۔ جس نے دنیا میں طوفان اٹھا رکھا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تمام معرکوں میں شریک ہو کر داد شجاعت دی۔ خود حضرت اسماء بھی اپنے شوہر کی برابر گھوڑے پر سوار ہو کر جہاد میں شریک ہوتی تھیں اور شجاعت کے جوہر دکھایا کرتی تھیں (رضی اللہ عنہم) لہ آجکل سوشلزم اور بالشوزم کو مذہب کا دشمن بتایا جاتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں تحریکیں محض اقتصادی ہیں۔ جو مذہب کے تحت میں آسکتی ہیں۔ مذہب کے مقابلہ پر لانا ان تحریکوں کے قائدین کا تعصب ہے۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائے احقر کا رسالہ "آنے والے انقلاب کی تصویر" جو کتب خانہ فخریہ مراد آباد سے ملسکتا ہے قیمت ۱/۲ (محمد میاں)

فاشزم اور بالشوزم کی جنگ نے انسانی خون کو نالی کے پانی سے بھی زیادہ بے وقعت بنا دیا ہے۔ اس کا انکار نہیں ہو سکتا کہ اسلام نے افراد کی ملک[1] کو تسلیم کیا ہے۔ اس نے مرنے والے کی جائداد کو اس کے وارثوں کا حصہ[2] قرار دیا ہے۔

مگر اس صورت سے کہ ہادی برحق۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

لیس بالمؤمن الذی یشبع	وہ شخص مسلمان ہی نہیں جو خود پیٹ
وجارہ جائع	بھرے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے

یہاں اسلام اور کفر کی کوئی تخصیص نہیں۔ ہر پڑوسی کی بھوک [illegible] کو دور کرنا فریضۂ انسانیت قرار دیا ہے۔ جس کی تکمیل ہر مومن پر لازم ہے۔

المسلم من سلم المسلمون	مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے
من لسانہ ویدہ والمؤمن	اہل اسلام محفوظ رہیں اور مومن
من امنہ الناس بوائقہ	وہ ہے کہ سارے انسان اس کی اذیت
(ترمذی شریف)	سے بے خوف ہوں۔

غور کرو اور سوچو۔ کسی شخص کے پاس ایک لاکھ روپیہ کا ہونا تباہ کن نہیں۔ تباہ کن یہ ہے کہ وہ روپیہ کو اس طرح دبا دے کہ اس کی ذات یا اس کی اولاد کے سوا کسی انسان کو اس کا فائدہ نہ پہنچ سکے۔

قرآن پاک کی اصطلاح میں اس کو کنز کہا جاتا ہے۔ جس کو حرام قرار دیتے ہوئے رب العالمین نے ارشاد فرمایا ہے:-

[1] ملک کے معنے سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نظریہ کے بیان میں پہلے گذر چکے [2] لطف یہ ہے کہ اس تقسیم میں قریب کے

والذين يكنزون الذهب والفضة ولا ينفقونها في سبيل الله فبشرهم بعذاب اليم. يوم يحمى عليها في نار جهنم فتكوى بها جباههم وجنوبهم وظهورهم هذا ما كنزتم لانفسكم فذوقوا ما كنتم تكنزون

پ ع ۵ ۱۱

جو لوگ سونے اور چاندی کو کنز بنا کر (جوڑ کر) رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں اسکو خرچ نہیں کرتے۔ اُنکو دردناک عذاب کی خبر سنا دو۔ جس روز کہ اس سونے اور چاندی کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائیگا۔ پھر اس سونے اور چاندی سے اُنکی پیشانیاں اُنکی کروٹیں اور اُنکی کمریں داغی جائیں گی (اور بتایا جائیگا) یہ وہی ہے جو تم نے اپنے نفس کے لیۓ جوڑ کر رکھا تھا۔ بس جو جوڑا کرتے تھے اُس کو چکھو ۱۲

تم کلام الٰہی کو بار بار پڑھو اور یقین کرلو کہ یہ اسی کا کلام ہے جس نے سارے جہان کو پیدا کیا۔ جو کالے اور گورے۔ غریب اور امیر سب کا خالق اور پروردگار ہے۔

اس میں شک نہیں۔ کہ جو شخص پس انداز رقم یا مال تجارت کا چالیسواں حصہ سالانہ ادا کرتا رہے وہ فریضہ زکوٰۃ کو ادا کر رہا ہے۔ اور اس عذاب سے نجات پا رہا ہے جو اس فرض کی عدم تعمیل کی صورت میں اس کے لیۓ مقرر کیا تھا۔

لیکن رحمت اور کرم کی ہمہ گیری یہ ہے کہ اسلام میں غنی یا امیر کا معیار صرف ۵۲ تولہ چاندی قرار دیا گیا ہے۔ [1]

جس شخص کے پاس ایک سال سے ۵۲ تولہ چاندی موجود ہو۔ اُس پر چالیسواں حصہ زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہوگیا۔ اسکے لیۓ زکوٰۃ لینا حرام اور بھیک

[1] غور کر دیا تو کاروبار کرو جس سے عام انسانوں کو بھی فائدہ پہنچیگا اور مالک کو بھی۔ ورنہ چالیس سال میں تمام سرمایہ ختم ۱۲

مانگنا اس سے بھی زیادہ حرام۔

(۳) اگر حفاظتِ ملت کا تقاضا زکوٰۃ کے علاوہ مزید رقم کا مطالبہ کررہا ہو۔ تو خلیفہ کو اس کا وصول کرنا بھی جائز ہے اور امت پر اُس کی تعمیل واجب ہوگی۔

بہرحال دیگر احادیث اور امت کے اجماع نے ہر اُس دولت کو کنز قرار دیا ہے جس کی زکوٰۃ نہ ادا کی جائے۔

اب جس شخص کے پاس ایک لاکھ روپیہ موجود ہے وہ کنز ہے۔ جس وقت تک ۲½ فیصدی کے حساب سے اُس کی زکوٰۃ ہر سال ادا کرتا رہے۔ اسی صورت سے مویشی پر اور غلہ پر علیحدہ علیحدہ زکوٰۃ مقرر کی گئی ہے۔ جو نسبتاً اس سے زائد ہی ہوتی ہے۔ مثلاً ۳۰ گائے بیل کے مالک پر ایک سالہ بچھڑا ادا کرنا فرض ہے۔ چالیس بکریوں پر ایک بکری اور دس من غلہ پر ایک من غلہ

ہمیں اس موقعہ پر ابواب الزکوٰۃ کی تشریح نہیں کرنی۔ صرف یہ بتانا ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ فرض کر کے ہر دولتمند کی دولت میں غریب کا حصہ مقرر کر دیا ہے۔

(۴) اور پھر محض فریضہ زکوٰۃ ہی پر قناعت نہیں کی گئی۔ بلکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرما دیا۔

ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ زکوٰۃ کے سوا بھی مال میں حق ہے۔

(۵) علاوہ ازیں مسلم کی بہتر شان یہ ہے کہ وہ کسب معاش کی جائز جدو جہد پوری طرح کرکے جو کچھ کمائے اس کو جمع نہ کرے شریعت کے مطابق خرچ کرتا رہے اسی کو توکل کہا گیا جس کے بہت زیادہ فضائل اور مراتب بیان کئے گئے
(۶) اسکے علاوہ احتکارِ[1] تلقی جلب[2] وغیرہ کی ممانعت فرماکر اور یہ اصول مقرر کرکے کہ مفاد خاص پر مفاد عام کو قربان نہیں کیا جاسکتا یہ بتادیا کہ اسلام کی نظر میں نظام حکومت کا یہ مقصود نہیں کہ فاتح مفتوح کا آقا بن جائے اور ارباب حکومت کا اقتدار پرستش کی جگہ حاصل کرے

بلکہ اسلام کی نظر میں نظام حکومت کا مقصود یہ ہے کہ کمزوروں کے حقوق کا تحفظ ہو - اُن کے جان و مال کو خطرات سے محفوظ کیا جائے - چین اور آرام کی زندگی اُن کے لئے سہل سے سہل تر کردی جائے - اُن کو روحانی اور جسمانی اطمینان و سکون حاصل ہو - کہ اقتدار پرستوں کی چیرہ دستی سے محفوظ رہ کر ٹھنڈے دل سے اپنی عاقبت پر وہ غور کرسکیں - اور پھر کسی فرعون کے فرعونی اقتدار یا قارون جیسے سرمایہ دار کی دولتمندانہ برتری یا شداد و نمرود اور ابوجہل جیسے متعصب معاند کے معاندانہ غلبہ سے مرعوب

---

[1] جبکہ بازار میں غلہ کی ضرورت ہو تو غلہ کو اس لئے جمع کئے رکھنا کہ گراں نرخ سے فروخت کیا جائیگا - احتکار کہلاتا ہے -
[2] جو غلہ وغیرہ مضافات سے شہر میں لایا جارہا ہے اس کو شہر سے باہر پہنچکر راستہ ہی میں اس لئے خرید لینا کہ شہر میں اپنی خواہش اور اغراض کی بموجب گراں بیچکر نفع حاصل کیا جائیگا - اگرچہ باشندگان شہر کے لئے پریشانی پیش آئے ۱۲

ہو کر نہیں۔ بلکہ اپنا اور اپنے خالق کا ایک باہمی رابطہ اور تعلق سمجھ کر سیدھا اور سیدھا راستہ مابعد الموت کی اصلاح اور درستی کے لئے تجویز کر سکیں۔

قاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ	اُن سے جنگ کرو تا آنکہ فتنہ نہ رہے
و یکون الدین للہ	اور دین اللہ کے لئے ہو جائے۔

آیۂ کریمہ پر منصفانہ غور کیجئے۔ ایک مومن کو فتنہ اور فساد کے رفع کرنے کے لئے کس طرح جنگ و قتال کا حکم دیا گیا ہے۔ وہ فتنہ خواہ کفر و شرک کا ہو۔ جو بدترین فتنہ ہے۔ جس میں انسان اپنے فاطر ہستی ہی کا انکار کر بیٹھتا ہے یا ظلم و تعصب کی یہ انتہا پسندی ہوتی ہے کہ خالق کے سوا دوسروں کو بھی خالق کے حقوق دینے لگتا ہے۔

جو انسان خود اپنے خالق کے متعلق صحیح راستے نہ قائم کر سکے۔ اور اس کے ساتھ منصفانہ معاملہ نہ قائم کر سکے وہ ہم جنس یا زیر دست کے ساتھ کب انصاف کر سکتا ہے۔

پھر لفظ فتنہ کوئی شرک و کفر کے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ بلکہ فرعون کی ملوکیت۔ قارون کی سرمایہ داری۔ شداد اور نمرود کا عناد اور تمرد بالخصوص یہ سب فتنہ ہی ہے۔ جن میں سے ہر ایک کے مٹانے کا ایک مومن کو حکم ہے۔ اور جب تک وہ اٹھ نہ جائے اس وقت تک جنگ و قتال کے جاری رکھنے کا حکم لازم کر دیا گیا ہے۔ اعتراض کیا جاتا ہے کہ قرآن پاک میں مسلمانوں ہی کو زمین کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ تو لامحالہ ایک جماعت کا اقتدار اعلےٰ تسلیم کر لیا گیا۔ اب تمام دنیا کے لئے راحت و آرام کے دل پسند اور خوش

آہند دعوے تو محض ہاتھی کے دانت ثابت ہوئے۔

بیشک درست ہے۔ مسلمان ہی کو نظام حکومت کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ اور قرآن پاک ایں صرف اسی سے جہاد کا مطالبہ بھی کیا جا رہا ہے۔ اسی کو محافظ عالم بھی گردانا ہے۔ مگر کیوں؟۔۔۔

آیا اس لئے کہ وہ عرب کا رہنے والا ہے۔ یا اس کی رنگت سفید ہے۔

یا اس شخص کی نسل میں سے ہے۔ ہرگز نہیں۔۔ بلکہ محض اس لئے کہ قانون الٰہی یعنی وہ نظام حکومت جس کو تمام دنیا کے لئے بھر اسمر رحمت اور اطمینان بنا کر آسمانوں سے اوپر سے اتارا گیا ہے۔ اس پر قائم رہ کر اور اس کے بموجب عمل کرنے کا عہد اسی نے کیا ہے۔ لامحالہ قانون کا ذمہ دار اسی کو گردانا جائیگا جس نے اس کے حق میں وفادار رہنے کا حلف کیا ہو۔

اس کی مثال اس طرح خیال فرمایئے کہ انڈیا ایکٹ کے بموجب ۱۹۳۶ء میں ہندوستان کے سات صوبوں میں کانگریس کی اکثریت ہوگئی۔ اور وزارت بنانے کا اختیار اسی پارٹی کو ملا۔ تو کانگریس کے ہائی کمانڈ نے اعلان کر دیا کہ ارکان وزارت صرف وہی حضرات ہوں گے جو کانگریس کے (پلیج) عہد نامہ پر دستخط کر دیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ اعلان کیوں تھا؟ اور آیا یہ انصاف تھا یا ظلم۔ ہمارا فیصلہ تو یہی ہے کہ کانگریس کو یہ اعلان کرنا ضروری تھا۔ ورنہ صرف یہ کہ اس کا یہ حق تھا بلکہ یہ اسپر لازم تھا۔ کیونکہ جن اصلاحات کو لیکر کانگریس میدان انتخاب میں آئی تھی ان کی عملی صورت اس کے بغیر ممکن نہ تھی۔

کہ کابینۂ وزارت میں تمامتر وہی لوگ ہوں جو کانگریسی اصول کو تسلیم کرچکے ہوں - اور اُس کی اصلاحات کے حامی ہوں -

مگر بحث یہ ہے کہ کیا وزارت کے قبول کرنے کا یا نظامِ حکومت کے ذمہ وار بننے کا نام ملوکیت یا سرمایہ داری ہے ---؟ -

بہرحال رب العالمین - پروردگار دو عالم - نوع انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ تم سب اس خداوندی قانون کے سامنے سر تسلیم کرو اور اُس پر عمل کرو - اُس کے بموجب دنیا میں نظام حکومت قایم کرو - اور چین و آرام کی زندگی بسر کرو - اور جو اُس کے مقابل آکر دنیا میں فتنہ و فساد پھیلانا چاہے اس کو شکست دو - اُس کو یہانتک عاجز کردو کہ وہ تمہارے اقتدار کے سامنے اپنی گردن جھکا دے - تاکہ تم دربار خداوندی کی منظور فرمودہ اصلاحات کو دنیا میں نافذ اور جاری کرسکو -

قاتلوھم حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون — اُن سے جنگ کرتے رہو تاآنکہ چھوٹے بنکر تمہیں جزیہ دینے لگیں -

---

مگر کیا جزیہ وصول کرنا سرمایہ داری ہے - ہرگز نہیں ؟

جزیہ تو اس لئے وصول کیا جاتا ہے کہ نظام حکومت کا ایسا خرچ برداشت کیا جا سکے جس میں خلیفہ کا حصہ بھی وہی ہو جو ایک عام ملکی کا ٹیکس اس لئے نہیں لیا جاتا کہ سا مانوں کو کلکٹر بنا کر دو ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ دیتے رہو - تاکہ وہ جائز اور ناجائز عیاشی میں خدا کی دولت کو

صرف کرتے رہیں۔ اور ماتحتوں کو دس دس پندرہ پندرہ روپیہ دیکر بھوکے مارتے رہیں۔ تاکہ وہ حاجتمند ہو کر ہمیشہ تمہارے دست نگر رہیں اور تمہارے سامنے اسی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے رہیں۔ جیسے ایک پرہیزگار بندہ اپنے خدا کے سامنے۔ معاذ اللہ۔

نہیں۔ ہر گز نہیں۔ بلکہ احادیث مقدسہ میں تو اس طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے سے ممانعت وارد ہوئی ہے۔ زید عمر کی تو کیا حقیقت خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جائز نہیں قرار دیا کہ آپ تشریف فرما رہیں اور صحابی آپ کے سامنے کھڑے رہیں۔

قرآن پاک میں حضرت حق جل مجدہٗ نے اعلان فرما دیا

تلک الدار الاخرۃ نجعلها للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا والعاقبۃ للمتقین

اس دار آخرت کی نعمتوں کو ہم اُن ہی کے لئے مخصوص کر دیں گے جو زمین پر متکبرانہ بلندی اور فساد کے خواہاں نہیں ہوتے اور آخرت کی کامیابی صرف پرہیزگاروں کے لئے ہیں۔

بحث بہت طویل ہو گئی۔ جو موضوع کتاب سے خارج ہے۔ اگرچہ ضرورت کے بموجب ہے۔ ہم اس وقت اس سے زیادہ تفصیل کو دوسرے رسالہ کے حوالہ کرتے ہیں

ع ملاحظہ ہو جعفر کا رسالہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور سیاسی انقلاب۔ ملنے کا پتہ کتب خانہ فخریہ شاہی کمپنی مرادآباد

تاہم جبکہ سرمایہ داری کی بحث چھڑ گئی ہے تو چند سطور اور درج کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

گذشتہ بیان میں سرمایہ داری کی ایک مثال پیش کی گئی تھی۔ لیکن آج جس سرمایہ داری پر بحث کی جا رہی ہے۔ اُس کی تفسیر یہ ہے کہ:۔

دولت کے نفع کی تقسیم غیر مساوی ہو۔ رفاہ عام کی چیزوں پر زر پرستوں کا تسلط ہو جائے اور عام انسانی طبقہ۔ اُس کے عام منافع سے محروم ہو جائے[1]۔

اس سرمایہ داری کا وجود مشینوں اور ملوں سے ہوا ہے اور اس کا مرکز یورپ ہے۔ جہاں کے ملوں اور مشینوں نے ہندوستان کی تمام صنعت و حرفت کو بیکار کر کے کروڑہا بندگان خدا کو بھوکا اور فاقہ مست کر دیا۔ اور اُن کے حصہ کا تمام روپیہ نفع کی شکل میں کھچ کھچ کر یورپ جا رہا ہے۔ ہندوستان کا ادنیٰ اور متوسط طبقہ سرگردان اور پریشان ہے اور تباہ حال۔

اس کی آسان مثال یہ ہے کہ پانی بھرنے کے لئے دہلی میں مثلاً سیکڑوں بہشتی کام کرتے تھے۔ وہاں پانی کے نل لگ گئے۔ بہشتی بیکار ہو گئے۔ اور جو کچھ بہشتیوں کی مزدوری تھی اُس کا حصہ نلوں کے مالکان کے خزانہ میں داخل ہوا۔

ہر ایک میونسپلٹی اپنے ہاں ملازم رکھتی تھی جن سے رات کے وقت لالٹینیں روشن کرایا کرتی تھی۔ اب جگہ جگہ بجلی ہو گئی۔ وہ سارے

[1] بالفاظ آسان۔ عوام کے مفاد کو خاص خاص افراد پر قربان کیا جائے۔

ملازم بیکار ہو گئے۔

پہلے شکر بنانے کے کولہو تھے۔ جن میں سیکڑوں آدمی کام کرتے تھے۔ اب مل ہو گئے۔ سیکڑوں آدمیوں کا کام چند آدمی کرنے لگے۔ صرف ایک شخص ملازم ہوا اور کم از کم پچاس بیکار ہو گئے۔

ایک شخص ایک دن میں پانچ گز کپڑا بنتا ہے اور ایک مشین پانسو گز۔ تو ایک مشین سو آدمیوں کا کام کر رہی ہے۔ جس پر تین چار آدمی ملازم ہیں۔ باقی سب بیکار۔

اب اگر یہ ملوں کے مالک دس بیس میل زمین خرید کر مشین کے ذریعہ سے کاشت کرانے لگیں۔ تو پھر آپ غور فرمائیں کہ دیہات کے کاشتکاروں اور زمینداروں کی حالت کیا ہو گی

ان مشینوں اور ملوں کے ظہور نے عام انسانی طبقہ کو مفلس اور بھوکا کر دیا ہے۔

جس سے وہ نہ دنیا کے رہے نہ دین کے۔ پراگندہ روزی پراگندہ دل ان تمام غریبوں کی مزدوری کا حصہ مالکان مل کی جیب میں جا رہا ہے۔ اسی کا نام ہے دولت کی غیر مساوی تقسیم۔ اب دنیا اس پریشانی کے حل میں سرگرداں ہے۔

حل کی دو ہی صورتیں ہیں۔

(۱) تمام مشینوں کو ختم کر دیا جائے (۲) مشینوں کو افراد کی ملک سے خارج کر کے حکومت کی ملک قرار دیا جائے۔ تمام ملک کو ایک گھرانا جیسا فرض

کر لیا جائے - ہر ایک کے لئے کام ورنہ وظیفہ دینا حکومت کا فرض ہو -
(دل صورت سر دست ناممکن ہے - دوسری صورت پر عمل کیا جا رہا
ہے جس سے بالشوزم - سوشلزم - کمیونزم وغیرہ کی تصویریں دنیا کے سامنے
آ رہی ہیں -

اور چونکہ ان تصویروں کے پس پردہ انسان کی دولت اور فاقہ کا
سوال ہے - لہٰذا ان تصویروں میں قدرتی طور پر ایسی متمیت پیدا ہو گئی
ہے کہ جس نے تمام دنیا کو تہ و بالا کر دینے کا تہیہ کر لیا ہے -

مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان وہ رقابت اور عداوت پیدا
ہو گئی ہے کہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہوتا جا رہا ہے -

اسپین کی جنگ میں ایک بھائی کی خوشی اس میں تھی کہ اس کا دوسرا
بھائی اس کی آنکھوں کے سامنے تلوار کے گھاٹ اتارا جائے - کیونکہ وہ
سرمایہ دار تھا - یہ مزدور تھا - اس نے اپنی سرمایہ داری کے دور میں اس
مزدور کی بھوک، پیاس - کمزوری اور بیماری پر کچھ بھی رحم نہیں کھایا تھا -

حساب لگایا گیا ہے کہ اگر ہندوستان میں جاپانی یا روسی طرز کا
نظام حکومت ہو جائے - تو ایک متنفس بھی بھوکا نہ رہے - اور اس کا حساب
بھی نہایت مختصر ہے -

آج کل کم از کم ۸۰ فیصدی کپڑا - برتن وغیرہ صنعتی چیزیں بیرون
ہند سے آتی ہیں - مل اگرچہ قائم ہو گئے ہیں - مگر ان کی مشینیں - ان کے تیل
وغیرہ سب باہر سے آتے ہیں -

اور جو کچھ ہندوستان میں تیار ہوتا ہے وہ تقریباً ۲۰ فیصدی ہے
بہرحال اس ۲۰ فیصدی کی تیاری کے لئے کم ازکم دو کروڑ آدمی ضرور کام کرتے ہیں۔ اگر ۸۰ فیصدی کی آمد بند ہو جائے تو اُس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ دس کروڑ آدمی کام پر لگ جائیں گے۔

آج گورنمنٹ کے ٹیکسوں کی بھرمار یہاں تک ہے کہ ہندوستان کا بنا ہوا کپڑا یا ہندوستان کی بنی ہوئی شکر۔ جاپان کے کپڑے اور دیگر مصنوعات کے مقابلہ میں گراں پڑتی ہے۔

باوجودیکہ مزدوری اور خرچ جاپان کے مقابلہ پر بہت کم ہے۔
ہندوستان آزاد ہو تو ٹیکسوں میں تخفیف کرکے ساری دنیا سے زیادہ سستا مال تیار کر سکتا ہے۔ اور یورپ کو خاص لندن اور پیرس میں اس طرح اقتصادی شکست دے سکتا ہے جس طرح سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں دیتا رہا تھا۔ پھر آپ خود ہی غور فرمائیں کہ دولت کس کے پاس ہوگی۔ اور سونے کی چڑیا ہندوستان ہوگا یا یورپ۔ اس بحث کی تفصیل تو آپ احقر کے رسالہ "انقلاب کی تصویر" میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں تو صرف یہ عرض کرنا تھا کہ آج جس سرمایہ داری کی بربادی کے لئے نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ اُس سے اس قسم کی سرمایہ داری مراد ہوتی ہے۔ اس قسم کی سرمایہ داری کا وجود سلف صالحین کے زمانہ میں نہیں تھا۔ لہٰذا کوئی خاص حکم بھی اس کا ملنا مشکل ہے۔ البتہ عمومی طور پر ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ جب بھی کسی مخصوص جماعت اور عام منافع کا تصادم

ہو تو اسلامی نظام حکومت کا پہلا فرض ہوگا کہ وہ دخل انداز ہوکر اُس کے مضرت رساں پہلو کا خاتمہ کردے۔ کیونکہ نظام حکومت کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی مخلوق امن و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرسکے۔ اعتراض کیا جاتا ہے کہ سرمایہ داری کی اس تباہ کاری کا دفعیہ تو صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ملکیت کی نفی کردی جائے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ محض فریب نظر ہے۔ ملکیت کی تحدید سے بھی وہی منافع ہو سکتے ہیں جو ملکیت کی نفی سے۔

اس نکتہ پر آکر آج کی جدید تحریکات اسلام سے ہٹی ہوئی ہیں۔ اسلام نے افراد کی ملکیت[ع] تسلیم کی ہے۔ ملکیت کی نفی فطرت انسانی کے مخالف ہے۔ اسلام خلاف فطرت تعلیم نہیں دیتا۔ اُس کو صحیح اصول پر ہموار کرتا ہے۔ اسلام زکوٰۃ۔ عشر وغیرہ فرض کرکے افراد کی ملک کو جمہور کے لئے فائدہ بخش بناتا ہے۔

اور اس پر بھی اگر جمہور کے منافع کا تصادم باقی رہے تو ملکیت کی نفی کے بجائے اُس پر حد بندی کرسکتا ہے۔

غور کرو اور سوچو۔ اگر آپ کا نظام حکومت افراد کی ملکیت تسلیم کرتے ہوئے ملوں، اور مشینوں کو (یعنی ایسی چیزوں کو جن کے ذریعہ سے دولتمند جمہور کو تباہ کرسکتا ہے) صرف حکومت کا مخصوص حق قرار دیدے۔ تو کیا یہ تباہ حالی پھر بھی باقی رہ سکتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ قانون اسلام کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ وہ

ع اگرچہ ملک کے وہ معنی ہیں جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا نظریہ بیان کرتے ہوئے تحریر کئے گئے
محمد میاں

انسانوں کے بیمہ کرنے والے کا بنایا ہوا ہے - وہ جمہور کی اقتصادی تباہ حالی کو کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتا -

پہلے ہم نے چند حدیثیں پیش کی تھیں - تفصیلات کے لئے مستقل تصنیف[عہ] کی ضرورت ہے - یہاں چند چیزیں بطور مثال پیش کی جاتی ہیں -

---

(۱) احتکار - غلہ کو ضرورت کے وقت اس لئے بازار میں نہ لانا کہ گراں ہونے پر فروخت کیا جائیگا - تو نفع زیادہ ہوگا - اسلامی اصطلاح میں احتکار کہتا ہے - اس کے متعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے -
لا یحتکر الا خاطی صرف خطا کار ہی احتکار کرسکتا ہے (ترمذی ص۱۵۴ ج ۱)

(۲) دیہات سے جو غلہ شہر میں لایا جارہا ہے اس کو راستہ ہی میں خرید لینا - تاکہ وہاں سے سستا مل جائے - اور شہر میں گراں فروخت کیا جاسکے اور اس طرح نفع زیادہ حاصل کیا جاسکے - اصطلاح شریعت میں تلقی جلب کہلاتا ہے - اس کے متعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ممانعت صحیح احادیث میں موجود ہے -

(۳) گھاس - پانی اور آگ کو عام قرار دیتے ہوئے خاص خاص باتوں کے سوا اُس پر بندش عائد کرنے سے ممانعت فرمائی گئی ہے -

(۴) خلیفہ کے لئے حکم ہوا کہ وہ آباد اور قابل کاشت بنانے کے لئے

عہ ملاحظہ فرمائیے " رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور سیاسی انقلاب " ۔

صرف وہی زمین کسی کو دے سکتا ہے۔ جہاں تک لوگوں کے مویشی نہ پہنچ سکتے ہوں۔ وغیرہ وغیرہ

(۵) عہدِ رسالت میں خیبر فتح ہوا۔ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی مفتوحہ اراضی مجاہدین کو تقسیم فرما کر یہودِ خیبر کو اجرت پر دلوا دی۔ کہ وہ کاشت کرتے رہیں اور پیداوار کا مخصوص حصہ مالکوں کو دیدیں۔ اور حکومت کے لیے یہ حق محفوظ رکھا تھا کہ وہ جب چاہے ان کاشتکاروں کو بے دخل کر کے خیبر خالی کرالے۔

جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں سواد عراق فتح ہوا تو مجاہدین کا مطالبہ ہوا کہ وہ عراق کی مفتوحہ اراضی بھی اسی صورت سے مجاہدین پر تقسیم کر دیں۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس پر راضی نہیں ہوئے۔

حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ ایک وفد لیکر بارگاہ فاروقی میں حاضر ہوئے۔ خیبر کے علاقہ سے استدلال کرتے ہوئے تقسیم عراق کا مطالبہ کیا۔ اور اسی کو شرعیت کا اصولی حکم قرار دیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بنو نضیر اور بنی قریظہ کی ضبط شدہ جائدادوں کی نظیر پیش کرتے ہوئے آیۂ کریمہ ما افاء اللہ علی رسولہ من اھل القری فللّٰہ۔ تا۔ والذین جاؤ من بعدھم سے استدلال کیا۔ اور فرمایا عہ

لولا ان یترک آخر الناس　　اگر بعد کے آنے والے خالی نہ رہ جاتے تو

عہ کتاب الخراج امام ابو یوسف ص۳۵۔ کتاب الاموال ابو عبید ص۱۵۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو احقر کا رسالہ رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم اور سیاسی انقلاب۔

لاشئ لیضم ما فتح اللہ علی المسلمین قریۃ الا قسمتھا سھما نا کما قسمت خیبر سھما نا۔ ولکنی اخشی ان یبقی اخر الناس لاشئ لھم	جو بستی بھی فتح ہوتی ہیں اس کو حصے کرکے مسلمانوں کو اسی طرح دیدیتا جس طرح خیبر تقسیم کردیا گیا تھا۔ لیکن مجھے خوف ہے کہ بعد کے آنیوالے لوگ خالی رہجائیں گے۔ اُن کے پاس کچھ بھی نہ رہے گا۔

کتاب الخراج امام ابو یوسف صہ ۳۵

کتاب الخراج یحیی بن آدام صہ ۴۲

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت تھا تو یہ سوال پھر اٹھایا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔

لولا ان یضرب لبعضکم وجوہ	اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ تم میں آپس میں جنگ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حضرت امام ابو یوسف رح فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ کو شرح و بسط سے بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں "مفتوحہ اراضی کو مجاہدین پر تقسیم نہ کرنے کا فیصلہ ایک توفیق الہی تھی کہ خداوند عالم نے اپنی کتاب (قرآن پاک) کی روشنی میں حضرت فاروق رض کو یہی سمجھادیا۔ عام مسلمانوں کا نفع اسی میں تھا کہ اس قسم کی اراضی کی آمدنی حکومت خود حاصل کرے نہ مستحقین پر تقسیم کردے کیونکہ اگر وقت کی حیثیت دیگر اس کی آمدنی سے وظیفے (الاؤنس) نہ دیے جاتے تو نہ سرحدوں کی حفاظت ہوسکتی۔ نہ چھاونیوں کے انتظامات ہوسکتے۔ نہ جنگی طاقت میں زیادتی ہوسکتی۔ اور نہ ملک انقلابات سے محفوظ رہ سکتا۔ کتاب الخراج ملخصاً صہ ۲۶

بعض لقسمت هذا السواد   وجدل ہونے لگے گا تو میں سواد عراق
بینکم (کتاب الخراج یحیی بن آدم ص۲۷)   کی زمینوں کو تقسیم کر دیتا۔

غرض اراضی سواد حکومت کی ملک رہیں البتہ اُن کی آمدنی سے مجاہدین کے وظائف مقرر کر دئے گئے۔

(۶) اس سے بھی زیادہ عجیب یہ تھا کہ جب عراق پر فوج کشی ہو رہی تھی تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اگر وہ جہاد میں شریک ہوں تو قانون اسلام کے بموجب خمس نکالنے کے بعد باقی زمین اور ضبط کردہ اموال کا ۱/۴ یا ۱/۳ تم کو دیا جائیگا۔

چنانچہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ اپنے قبیلہ کے نوجوان اتنی تعداد میں لے گئے کہ جنگ قادسیہ کی تمام اسلامی فوج میں ایک چوتھائی تعداد صرف ان کے

ع حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ العزیز۔ اراضی کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔ بنا برآنچہ حضرت شیخ جلال الدین تھانیسری در رسالہ خود اختیار فرمودہ اند کہ زمین ہندوستان در ابتدائے فتح مانند سواد عراق کہ در عہد حضرت فاروق رضی اللہ عنہ مفتوح شدہ بود موقوف بر ملک بیت المال است و زمینداران را بجز تولیت و زراعت و حفظ دخلے نیست۔ چنانچہ لفظ زمیندار نیز اشعارے باں میکند و تغیر و تبدل زمینداری و عزل و نصب زمینداران اخراج بعضے از آنہا و اقرار بعضے و عطا بعضے اراضی با فغانان و بلوچان و سادات دقدوانیاں بصیغہ زمینداری دلالت صریحہ بریں می کند۔ پس دریں صورت د باقی صفحہ آئندہ ؎

قبیلہ والوں کی تھی۔ فتح کے بعد وعدہ کے بموجب ایک ربع حضرت جریر رضی اللہ عنہ اور ان کے قبیلہ والوں کو دیدیا گیا۔

چنانچہ ایک سال تک وہ اراضی اُن کے قبضہ میں رہی۔ مگر اس کے بعد جب حضرت جریر رضی اللہ عنہ ملاقات کے لئے حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے مذکورۂ بالا نظریہ کی بنا پر فرمایا:

اما واللہ لولا انی قاسم مسئول لکنتم علے ماقسم لکم فاری ان تردہ علے المسلمین ففعل فاجازہ ثمانین دینار۔ وفی روایۃ فاعطاھم ثمانین دینار۔
کتاب الخراج یحییٰ بن آدم صـ۳۵ـ

دیکھو خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ اگر میں قاسم مسئول تقسیم کرنے والا جس سے قیامت کے دن باز پرس ہوگی) نہ ہوتا تو تم اسی تقسیم کے بموجب مالک رہتے۔ مگر اب میری رائے یہ ہے کہ اس تمام علاقہ کو عام مسلمانوں کے حق میں واپس کردو۔ چنانچہ حضرت جریر نے وہ تمام علاقہ واپس کر دیا۔ اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے بطور انعام انکو اسی دینار دیئے

اس قسم کے بہت سے واقعات اسلام کی اصولی کتابوں میں موجود ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جمیع آراضی ہندوستان مملوک بیت المال گشت۔ و بعقد مزارعت بر نصف یا بر کم از نصف در دست زمینداران ۱۲ (فتاوی عزیزیہ صـ۱۳۲ مجتبائی) اسی مضمون کا فتویٰ جلد ثانی میں

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چند الفاظ میں خلیفہ اسلام کی حیثیت ہی بتا دی کہ

قاسم مستوءل — تقسیم کرنے والا جس سے باز پرس کی جائے گی یعنی جو بارگاہ رب العزت میں جوابدہ ہے۔

مقصود کی طرف رجوع اس طویل تحریر سے سرمایہ داری اور ملوکیت کے متعلق اسلام کے نکتہ نظر پر ایک خفیف سی روشنی پڑ گئی۔

اسلامی نظام حکومت کے متعلق بحث بہت طویل ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا محمد بن عبداللہ منصور انصاری کی تصانیف ملاحظہ فرمائی جائیں ؎

تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر کچھ اصولی چیزیں قرآن پاک سے بھی پیش کر دی جائیں

(الف) حقیقت یہ ہے کہ اسلامی اصول کے لحاظ سے حکومت اور ملوکیت صرف حق جل مجدہ کا حق ہے

"احکم الحاکمین" اسی کا خطاب ہے۔ ملک اسی کا ہے۔ زمین کا مالک وہی ہے۔ جامعہ بشریت کو قانون کی حدود میں جکڑ بند کر سکنا صرف اسی کا حق ہے

ان الحکم الا للہ "قانون صرف خدا کا ہے"

کیونکہ وہ رب العالمین ہے۔ (تمام جہانوں کا پیدا کرنے والا اور پالنے والا) وہی "رب الناس" ہے۔ سارے انسانوں کا پالنے اور پیدا کرنے والا۔ لہذا وہی ملک الناس ہے۔ یعنی انسانوں کا بادشاہ۔ اور اسی لئے

؎ ان کتابوں کا مفصل حال آپکو رسالہ "قائد" مراد آباد سے ربانی حاشیہ صفحہ پر

وہ الٰہ الناس ہے۔ سارے انسانوں کا معبود۔

لہ ملک السموات والارض   آسمانوں اور زمینوں کا مالک اسی کا ہے

انسان کو دنیا میں خلیفہ اور نائب کی حیثیت سے پیدا فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ارشاد ہوا تھا۔

انی جاعل فی الارض خلیفہ   میں زمین میں خلیفہ بناتا ہوں۔

(ب) انسان اگرچہ ایک ماں اور ایک باپ ہی کی اولاد ہیں۔ مگر جغرافیائی تفاوت اور سوسائٹیوں کے اختلاف سے اُن کے مذاق اور ان کی طبیعت میں اتنا اختلاف ہو گیا کہ وہ بہت سے خونخوار اور جنگجو دشمنوں کے وارث معلوم ہوتے ہیں۔

ایسی صورت میں کوئی قانون خواہ وہ کتنے ہی جمہوری اصول سے بنایا جائے۔ ناممکن ہے کہ روئے زمین کے تمام انسانوں کے لئے یکسانیت کے ساتھ فائدہ بخش ہو۔

البتہ جو رب العالمین ان سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ ان کا مربی اور پالنے والا ہے۔ وہ یقیناً ایسا قانون بنا سکتا ہے جو سارے عالم انسانی کے لئے یکسانیت کے ساتھ فائدہ بخش ہو۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) معلوم ہو سکتا ہے۔ اس رسالہ میں حضرت موصوف کی غیر مطبوعہ تصانیف شائع بھی ہوتی رہی ہیں۔ اساس انقلاب و مراقبہ زمان حال کی تصنیف جو طبع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ احقر کا مسلسل مضمون "اسلام اور آئین حکومت" کی عنوان سے چل رہا ہے جسمیں انشاء اللہ ان تمام مباحث پر مفصل بحث آئیگی ۱۲

لہٰذا اصولی قوانین کی وضع کا حق حضرت حق جل مجدہ نے اپنے لئے مخصوص فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے عالم انسانی پر اُس کو نازل فرما دیا۔

انا انزلناہ حکماً عربیاً — ہم نے اس کو ایک قانون کی حیثیت سے نازل کیا ہے جس کی زبان عربی ہے۔

یہ مکمل قانون عالم انسانی کو عطا فرما کر اعلان فرما دیا۔

من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک هم الظالمون — جو خدا کے نازل کردہ قانون پر فیصلہ نہ دے وہ ظالم ہے۔

اس کی تفصیلات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ فرما کر ارشاد فرمایا:۔

ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا — جو رسول تم کو دیں۔ سے لو۔ اور جس سے روکیں رک جاؤ۔

رسول کے ارشادات کی توثیق اور تصدیق کے لئے ارشاد ہوا۔

ما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحیٰ — وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے جو کچھ وہ کہتے ہیں وحی ہی جو اُن پر نازل کیجاتی ہے

حکم ہوا کہ ایک جماعت ایسی پیدا ہوتی رہے جو اس قانون کی منشا کو سمجھ سکے اور اس کے بموجب آنے والے جزئیات کے احکام نکال سکے۔

لولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا — ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہر ایک جماعت میں سے ایک ٹولی چلی جایا کرے تاکہ دین کی مہارت

فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون — اور بصیرت حاصل کرے اور جب وہ اپنی قوم میں واپس آئے تو اُن کو خداوندی احکام سے آگاہ کرے۔ بہت ممکن ہو وہ سب خوف اور پرہیز کرنے لگیں۔

عام آدمی جو معاملات کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتے ان کو حکم ہوا کہ عام معاملات میں انہیں حضرات کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور انہیں کو اولی الامر اور ارباب حل وعقد قرار دیا جائے۔

واذا جاءھم امر من الامن اوالخوف اذاعوا بہ ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم (نساء ع ۱۱)۔ — اور جب اُن کے پاس کوئی امن یا خوف کی بات آتی ہو تو وہ خود ہی اسکو بے اڑتے ہیں۔ کاش وہ اسکو رسول اور اپنے اولوالامر کے پاس لیجاتے تاکہ وہ لوگ اسکو اچھی طرح جان لیتے جو خوب غور و فکر سے بات نکالا کرتے ہیں۔

مقدار خراج۔ فوج کشی۔ انتخاب خلیفہ وغیرہ وغیرہ معاملات جن کا تعلق استنباط سے نہیں۔ جو ارباب تجربہ کی رائے پر موقوف ہیں۔ اُن کے متعلق مسلمانوں کی شان یہ بیان کی گئی

امرھم شوریٰ بینھم — یعنی اُن کے معاملات کا آپس میں مشورہ ہوتا ہے، خلیفہ کو حکم ہوا۔

وشاورھم فی الامر۔ — اُن سے معاملات میں مشورہ کیا کرو۔

فاذا عزمت فتوکل علی اللہ پھر جب تم کسی بات کا عزم کر لو۔ تو اللہ پر بھروسہ کرو
عزم کا درجہ مشورہ کے بعد اور مشورہ کا نتیجہ قرار دے کر استبداد
کا قلع قمع کیا گیا۔ اور پھر یہ ایک خاص ہدایت ہے کہ بھروسہ کثرت[ع] پر نہ ہو
بھروسہ اللہ پر ہو۔

(ج) اس حکومت الٰہی کا منشا اور نقطۂ نظر قرار دیا گیا

رحمۃ احسان عدل تقویٰ

چنانچہ

(۱) اس قانون کو سراسر رحمت اور ہدی بتایا گیا

ولقد جئناھم بکتاب ہم اُن کو ایک کتاب دی ہے علم اور

[ع] کثرت رائے اور قلت رائے۔ مجارٹی اور مینارٹی کی بحث آج کل بہت چلی ہوئی ہے۔ اسلام نے کثرت رائے کا اعتبار کیا ہے یا نہیں یہ ایک طویل بحث ہے حضرت مولانا محمد میاں صاحب عرف منصور انصاری مقیم کابل جاء من از ہندوستان نے اس سلسلہ میں نہایت لطیف بات ارشاد فرمائی ہے۔ کہ اگر کسی ایک جانب نمایاں کثرت ہے تو اسکی اتباع امام پر لازم ہے۔ کیونکہ سواد اعظم کی اتباع کا حکم احادیث میں موجود ہے۔ اور اگر نمایاں کثرت نہ ہو۔ تو امام کو اختیار ہے کہ وہ اقلیت کی رائے منظور کر لے۔ جو حضرات سیرت اور تاریخ اسلام سے کافی واقفیت رکھتے ہیں ہمارے خیال میں وہ مولانا کے اس فیصلہ کی بہت تحسین اور آفریں فرمائیں گے (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو حکومت الٰہی مصنفہ مولینا موصوف)

فصلناہ علے علم ھدی   دانائی کے ساتھ۔ جسکی ہم نے تفصیل کی ہے
ورحمۃ لقوم یومنون ع ۱۲ پ ۹   تاکہ ایماندار قوم کے لئے رہنمائی اور رحمت ہو

(۲) اس قانون کا آغاز ہوا تو قانون بنانے والے کے نام کے بعد اُس کی صفت بیان کی گئی ہے۔

رب العالمین   سارے جہانوں کا مربی (پالنے پوسنے والا)
الرحمن الرحیم   بہت ہی زیادہ رحم کرنے والا۔ بہت مہربان

(۳) جس ذات کے ذریعہ سے یہ قانون بھیجا گیا اس کو رحمۃ للعالمین کا خطاب دیکر اُس کی بعثت کی وجہ یہ بیان کی گئی۔

وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین   صرف اس لئے تم کو ہم نے بھیجا ہے کہ سارے جہانوں پر رحم کریں۔

غور کرو۔ صرف مسلمانوں پر نہیں۔ صرف انسانوں پر نہیں۔ صرف جانداروں پر نہیں۔ صرف دنیا والوں پر نہیں۔ بلکہ سارے جہانوں پر رحمت کی وسعت کو دیکھو اور قانون کے منشا کو سمجھو

(۴) ارشاد ہوا:-

ان اللہ یامر بالعدل   اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے۔ عدل۔ احسان
والاحسان وایتاءذی   اور قرابتداروں کو دینے کا۔
القربیٰ   (قرآن حکیم)

پھر انصاف کی بھی یہ صورت کہ اپنے ماتحت۔ اہل ملک۔ دوست احباب کے ساتھ تو انصاف کرنا ہے ہی۔ خاص ان قوموں کے مقابلہ میں بھی

انصاف سے کام لو جن سے تمہاری دشمنی ہے۔ اور جن پر ظلم کو آج کل کی سیاست قوم پروری سمجھا جاتا ہے۔ ارشاد ہے:

لا یجرمنکم شنآن قوم علے ان لا تعدلوا۔ اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ	کسی قوم کی دشمنی تمہیں اسپر آمادہ نہ کرے کہ تم اسکے ساتھ انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو کیونکہ یہی پرہیزگاری کے قریب تر ہے

(د) خلافت یا وراثت ارضی کی اہلیت کے لئے عمل صالح کو اولین شرط قرار دیا گیا ہے۔

وعد اللہ الذین آمنوا منکم و عملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ۲۴ : ۷	تم میں سے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ اُنہیں زمین میں اسی طرح خلیفہ بنائے گا جس طرح اُن سے پہلوں کو خلیفہ بنایا تھا۔
ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون	ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھدیا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔
ان فی ھذا لبلاغاً لقوم عابدین (۲۱ : ۷)	اسی میں عبادت گذار قوموں کے لئے ایک پیغام عمل ہے۔

(افسوس آج ہم اس پیغام کو فراموش کر بیٹھے)

پھر یہ خلافت اور وراثت ارضی جن لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ انہیں تاکید کے ساتھ جتا دیا جاتا ہے کہ بندگان خدا پر جو تمہیں قدرت عطا کی گئی ہے وہ اللہ کی امانت ہے۔ اُس کو اپنی ذاتی ملک سمجھ کر نفسانی لذتوں کے حصول میں صرف نہ کرنا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو سلطنت عطا ہوتی ہے تو فرمان آتا ہے۔

یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھوی فیضلک عن سبیل اللہ ۔ ان الذین یضلون عن سبیل اللہ لھم عذاب شدید بما نسوا یوم الحساب ۲:۳۸

اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ تم انسانوں کے مابین حق و صداقت کے ساتھ فیصلہ کرو۔ اور خواہشات کی پیروی مت کرو کہ یہ تم کو خدا کی راہ سے بہکا دے گی۔ بیشک جو لوگ راہ خدا سے بہک جاتے ہیں اُنکو اس فراموشی پر حساب کے دن (قیامت کے روز) سخت عذاب ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

انھا امانۃ وانھا یوم القیامۃ حسرۃ وندامۃ الا من اخذھا بحقھا وادی الذی علیہ فیھا

بیشک یہ امامت (خلافت ایک امانت ہے) اور وہ قیامت کے دن حسرت اور ندامت ہوگی۔ صرف وہی لوگ مستثنیٰ ہونگے جو حق کے بموجب اس امانت کو لیں اور اس سلسلہ

(ص ۸ کتاب الاموال - ابو عبید) میں جو اُنپر واجب ہو اُس کو ادا کرتے رہیں۔

آج جو مہاتما کہلاتے ہیں ان پر بھی یہ الزام لگا یا جا رہا ہے۔ کہ وہ ڈکٹیٹری کے خواہاں ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی مخالفت کو بدترین جرم سمجھتے ہیں۔ باقی رہے ارباب حکومت تو اُن کی تو فطرت ہی گویا بدل جاتی ہے۔ وہ اپنے زیر دستوں کو یہی سمجھنے لگتے ہیں کہ گویا وہ انہیں کی پرستش کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

لیکن اسلام کا اعلان یہ ہے۔

تلك الدار الاخرة نجعلها للذين لايريدون علواً فى الارض ولافساداً والعاقبة للمتقين (۲۸: ۹)

اس دار آخرۃ کی نعمتوں کو ہم انہیں لوگوں کو دیں گے جو دنیا میں متکبرانہ سربلندی اور فساد کے خواہاں نہیں اور آخرت کی کامیابی صرف پرہیزگاروں کے لئے ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلے جو مسند خلافت پر جلوہ فرما ہوا۔ اُس نے سب سے پہلے خطبہ میں سب سے پہلا جملہ یہ فرمایا تھا۔

اما بعد فانى قد وليت امركم ولست بخيركم وان اقواكم عندى الضعيف حتى اخذ له بحقه - وان اضعفكم عندى القوى حتى اخذ

امابعد - میں تمہارے امر کا والی بنا دیا گیا ہوں۔ مگر تم سے بہتر نہیں بلاشبہہ کمزور انسان میرے نزدیک تم سب میں قوی ہے۔ جب تک اُس کے لئے اس کا حق نہ لیا لوں۔ اور قوی آدمی میری نگاہ میں تم سب میں کمزور ہے جبتک اس سے حق نہ وصول کر لوں۔

منہ ایہا الناس انما انا متبع ولست مبتدع فان انا احسنت فاعینونی۔ وان انا زغت فقومونی۔ (کتاب الاموال صفحہ ۵)	اے لوگو۔ میں پیرو ہوں۔ مبتدع اور اپنی عقل سے نئے طریقے ایجاد کرنے والا نہیں۔ اگر میں اچھے کام کروں تو تم میری مدد کرو۔ اور میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو تم مجھکو سیدھا کردو۔

پھر جب تک اسلامی خلافت اسلامی تعلیم کے بموجب قایم رہی یعنی جب تک اُس کا خطاب "راشدہ" رہا۔ اسی اصول پر عمل ہوتا رہا۔ جس کی سیکڑوں نظیریں تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں۔

خلیفہ دوم فاروق اعظم نے خطبہ خلافت میں ارشاد فرمایا۔

انما انا و مالکم کولی الیتیم ان استغنیت استعففت وان افتقرت اکلت بالمعروف۔ لکم علی ایہا الناس خصال فخذونی بہا لکم علی ان لا اجتبی شیئا من خراجکم ولا مما افاء اللہ علیکم الا من وجہہ ولکم علی اذا	میری حیثیت تمہارے مالوں کے مقابلہ میں صرف ایسی ہے جیسے یتیم کے ولی کی۔ اگر مجھکو ضرورت نہو (غنی ہوں) تو تمہارے مال سے دامن پاک رکھوں گا۔ اور اگر میں محتاج ہوں تو اتنی خوراک لیلوں گا جسکو عام طور سے مناسب تصور کیا جائے اے لوگو آپکے لئے مجھپر چند ذمہ داریاں ہیں۔ ان کے متعلق میری گرفت کرتے رہو۔ میرے اور تمہارا حق ہے کہ میں تمہارے خراج اور ان جائدادوں میں سے جو لبطور غنیمت تمکو لیں صرف اتنا ہی لوں

وقع فی یدی ان لایخرج منی الا فی حقہ	جتنا واجب ہو۔ دوسرا حق تمہارا میرا اوپر یہ ہے کہ جب کوئی مال میرے ہاتھ میں آئے تو وہ صرف اپنے موقعہ پر ہی خرچ ہو۔

تفصیلات بہت طویل ہیں صحیح نقشہ سمجھنے کے لئے دوسری کتابیں ملاحظہ ہوں۔ خلاصہ یہ کہ تمام شاہی امنگوں کو ختم کرنے کے بعد حکومت کی ذمہ داریوں کا جو خشک اور بے مزہ حصہ باقی رہجاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ

الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر	اُن کو اگر ہم زمین میں قدرت اور اختیار دیدیں۔ تو وہ نماز قائم کریں زکوٰۃ ادا کریں نیکی کا حکم کریں اور برائی سے روکیں۔ (۶۲ : ۶)

مختصر الفاظ میں اسلامی حکومت کا جامع نقشہ پیش کر دیا گیا۔
دور حاضر کے سوسلسٹوں اور بالشویک کو زیادہ صاف عملی نمونہ دیکھنا ہو تو ملاحظہ فرمائیں۔
" جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے۔ تو حضرت علیؓ (خلیفہ چہارم) نے فرمایا۔

ان اردت ان تلحق صاحبیک فارقع القمیص ونکس الازار۔ واخصف النعل۔ وارقع الخف	اگر تم چاہتے ہو کہ اپنے ساتھی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ) سے ملو تو کرتے میں پیوند لگاؤ۔ متکبروں کی طرح تہمد لٹکا کر مت چلو بلکہ اسکو الٹ لو۔ جوتی گٹھواؤ

وقصر الامل ۔ ز کل موزوں میں ٹکیاں لگواؤ۔ آرزو کم کرو۔
دون الشبع کتاب الخراج پیٹ بھر کر مت کھاؤ۔
ابو یوسف صفحہ ۱۵

تاریخ شاہد ہے کہ خلفاء راشدین کا یہی عمل رہا۔

یہ تمام بحث جو حد سے زیادہ اختصار کے باوجود کافی طویل ہو گئی۔ اس لیے تھی کہ جو شخص اسلام کے نام پر جہاد کرے۔ اگر وہ سچا ہے تو اُس کا نکتہ نظر کیا ہوگا۔ اور اگرچہ سید صاحب کے سامنے بظاہر صرف اسلامی حکومت کا نقشہ تھا۔ مگر کیا اُن کو آزادی ہند کا سب سے پہلا امام نہیں کہا جاسکتا ہے؟

اب اس بحث کا دوسرا پہلو ہمارے سامنے ہے کہ حضرت سید صاحب کے جہاد کا نشانہ رنجیت سنگھ تھا۔ یا اس کے پردہ میں مقصود کوئی اور تھا۔

؎ حضرت سید صاحب کی فقیرانہ زندگی اپنے ساتھیوں اور زیر اثر مجاہدین کے ساتھ مساویانہ برتاؤ۔ ایک ساتھ کھانا۔ ایک ساتھ رہنا۔ بلکہ سب کو کھلا کر خود کھانا۔ مزدوروں سے ملکر کام کرنا۔ تعمیر کے وقت مزدوروں کے ساتھ شریک ہو کر اینٹیں ڈھونا وغیرہ وغیرہ شاہد ہیں کہ آپ اگر کامیاب ہوتے تو دنیا کے سامنے اسی قسم کا مقدس نظام حکومت پیش فرماتے۔ چنانچہ جتنے حلقہ میں آپکی حکومت قائم ہوئی اس کا نقشہ اسی نمونہ کا تھا۔ مگر افسوس کہ قدرت کو منظور نہ تھا کہ تیرھویں صدی میں بھی پہلی صدی کو لوٹایا جائے۔

انگریز یا سکھ

امیرالمومنین سید صاحبؒ کے اعلان عام ہیں یہ الفاظ موجود ہیں جن کو جلی قلم سے لکھا گیا ہے:

ما ایم ہر چند عاجز خاکسار و ذرۂ بیمقدار اما بلاشک بمحبت حضرت حق سرشار و از محبت غیر حق بالکل دست بردار نہ با کسے از امرا مسلمین منازعت داریم۔ نہ باکسے از روساء مومنین مخالفت۔ باکفار لئام مقابلہ داریم نہ با مدعیان اسلام۔ صرف با درازمویان مقاتلہ نہ با کلمہ گویان و اسلام جویان۔ و نہ با سرکار انگریزی مخاصمت داریم۔ و نہ ہیچ راہ منازعت کہ از رعایا او ہستیم۔ و بجمایتش از مظالم برایا۔ (ص۱۷۵ سوانح احمدی)

(ترجمہ) ہم باوجودیکہ عاجز و خاکسار ذرہ بیمقدار ہیں۔ مگر حضرت حق جل مجدہ کی محبت میں سرشار ہیں اور غیر حق کی محبت سے دستبردار نہ کسی مسلمان امیر کے ساتھ منازعت ہے نہ کسی مومن رئیس کے ساتھ مخالفت۔ کفار لئام کے ساتھ مقابلہ ہے نہ مدعیان اسلام کے ساتھ۔ صرف سکھوں سے جنگ ہے نہ کلمہ گو اور اسلام جو سے اور نہ سرکار انگریزی سے ہمارا مقابلہ اور نہ کسی قسم کی کوئی منازعت کیونکہ ہم اسلی رعیت

ہیں اور اس کی حمایت میں تمام مظالم سے آزاد- اور بری-

---×---

اس قسم کے اعلانات اور تحریریں دیگر خطوط وغیرہ میں بھی حضرت سید صاحب کی طرف منسوب کی جاتی ہیں- اور بلا شبہہ جو حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مقدس ارشاد سے واقف نہیں کہ
الحرب خدعۃ - جنگ خفیہ تدبیر (پالیسی) کا نام ہے" اور جن حضرات کو یاد نہیں رہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ ۸ھ میں جب فتح مکہ کے لئے غزوہ کا ارادہ فرمایا تو صحابہ کرام کے قشون قاہرہ کو حکم دیا گیا تھا کہ فوجیں مدینہ طیبہ سے باہر (مکہ مکرمہ کے راستہ اور سمت کے برخلاف) شام کی جانب میدان میں جمع ہوں-

لیکن ہم جب واقعات کی کڑیاں ملاتے ہیں- تو صرف یہی یقین ہمارے مشکوک دل کو مطمئن کرتا ہے کہ اس تمام جد و جہد کا مقصد واصلی حریت وطن- استخلاص ملت- اور انگریزوں کا اخراج تھا-

اب واقعات کا تسلسل ملاحظہ ہو-

۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے دہلی پر حملہ کرکے شاہ عالم ثانی کو گرفتار کرلیا مگر اس وقت تک مسلمانوں میں زندگی موجود تھی- صرف نظم حکومت میں فرق آگیا تھا اگر شاہ عالم کو قتل کر دیا جاتا- تو یہ نیم خوابیدہ شیر چونک جاتا لہذا شاہ عالم کو دوبارہ تخت پر بحال کرکے وہ عجیب وغریب بھول بھلیاں ہندوستانیوں کے سامنے رکھی گئیں جس پر دنیا کی تاریخ ہمیشہ زہر خندہ کیا کرے گی

جس کا اندازہ عام اعلانات اور منادی کے اُن الفاظ سے ہو سکتا ہے جن کو منتر کے طور پر اس فسوں گو حکومت کا منادی ندا دیتے وقت (ڈھنڈورا پیٹتے اور ڈگڈگی بجاتے وقت کیا کرتا تھا۔

• حکم کمپنی بہادر کا ملک بادشاہ سلامت کا۔ سنو بھائیو۔۔۔ ڈھم ڈھم ڈھم

جن کی قسمت پر اد بار ناچ رہا تھا۔ جو اپنی اولاد کو انگریز کی غلامی کے حوالہ کر رہے تھے۔ وہ اس سے خوش ہوتے رہے کہ "ملک بادشاہ سلامت کا"

مگر خاندان ولی اللہ کے دور اندیش ماہرین سیاست کے لیے کس طرح ممکن تھا کہ اس ابلہ فریب پالیسی پر صبر کرتے۔

سیدنا حضرت شاہ عبدالعزیز نے فتویٰ صادر فرمایا۔

دریں شہر حکم امام المسلمین اصلاً جاری نیست۔ وحکم رؤساء نصاریٰ بے دغدغہ جاری است۔ ومراد از اجراء احکام کفر اینست کہ در مقدمہ ملک داری وبندوبست رعایا۔ واخذ خراج وباج وعشور اموال تجارت وسیاست قطاع الطریق۔ وسراق وفیصل خصومات وسزائے جنایات کفار بطور خود حاکم باشند۔ آرے اگر بعضے احکام اسلام راشل جمع وعیدین واذان وذبح بقر۔ تعرض نکنند نہ کردہ باشند۔ لیکن اصل الاصول ایں چیزہا نزد ایشاں ہباءً و ہدر است۔ زیرا کہ مساجد را بے تکلف ہدم می نمایند۔ وہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استیمان ایشاں دریں شہر ودر نواح نمی تواند آمد وبرائے منفعت خود وارد ین ومسافرین وتجار مخالفت نمی نمایند۔ اعیان

دیگر مثل شجاع الملک و ولایتی بیگم بغیر حکم ایشاں دریں بلاد داخل نمی تواند شد

دازیں شہر تا کلکتہ عمل نصاری ممتد است۔ آرے در چپ و راست مثل

حیدرآباد، لکھنؤ، و رام پور احکام خود جاری نکردہ اند۔ بسبب مصالحہ و

اطاعت مالکان آں ملک الخ فتاوی عزیزیہ ص ۱۷ ج ۱

(ترجمہ) اس شہر میں امام المسلمین کا حکم قطعاً جاری نہیں۔ رؤساء

نصاری کا حکم بلا دغدغہ اور بے دھڑک جاری ہے۔ اور احکام کفر کے جاری

اور نافذ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ملک داری۔ انتظامات رعیت۔ خراج۔

باج۔ عشر (مالگذاری) اموال تجارت۔ ڈاکوؤں اور چوروں کے انتظامات۔

سدمات کا تصفیہ۔ جرائم کی سزاؤں وغیرہ میں کافر بطور خود حاکم ہوں۔

ہاں اگر اسلام کے چند احکام جیسے جمعہ۔ عیدین۔ اذان۔ ذبح گاؤ۔

وغیرہ میں تعرض نہ کریں تو اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ (دارالحرب بدستور

باقی رہتا ہے)

لیکن ان چیزوں کا اصل اصول ان کافروں کے نزدیک بے کار

اور قطعاً بے حقیقت ہے۔ کیونکہ مساجد کو بلا تکلف شہید کرتے ہیں۔ اور

کوئی مسلمان یا کافر رعایا (ذمی) ان سے امن اور اجازت حاصل کئے

بغیر اس شہر اور اس کے نواح میں نہیں آسکتا۔ اپنے نفع کے واسطے آنیوالوں

اور مسافروں اور تاجروں سے مخالفت نہیں کرتے دوسرے حکام جیسے

شجاع الملک یا ولایتی بیگم اُن (نصاری) کے حکم کے بغیر ان شہروں میں

داخل نہیں ہوسکتے۔ اس شہر سے کلکتہ تک نصاری کی حکومت پھیلی ہوئی ہے

ہاں دائیں بائیں۔ جیسے حیدر آباد۔ لکھنؤ۔ رام پور میں ان ریاستوں کے حکام کی اطاعت اور اُن کی صلح جوئی کے باعث اپنے احکام جاری نہیں کئے ہیں۔ الخ

دوسرے فتوی میں ارشاد فرماتے ہیں

آنچہ مرقوم شد کہ معمولہ انگریز واشباہ ایشاں دار الحرب است یا نہ۔ پس بدانند آنچہ می گویند کہ دار الاسلام گاہے دار الحرب نمی شود ایں قول مرجوح است۔ واصح آنست کہ دار الاسلام دار الحرب میشود آرے دریں اختلاف است کہ کے میشود۔ طائفہ مے گویند کہ اگر یک چیز از شعائر اسلام ممنوع باشد مثل اذان وختان دار الحرب۔ میگردد و طائفہ گفتہ مدار صیرورۃ دار الاسلام دار الحرب بر محو شعائر اسلام نیست۔ بلکہ ہر گاہ شعائر کفر بے دغدغہ باعلان رواج گیرد دار الحرب مے شود۔ گو شعائر اسلام ہمہ برقرار باشند۔ وفرقہ سوم ازینہم ترقی کردہ اند کہ حد دار الحرب آنست۔ کہ ان لا یبقی فیہ مسلم ولا ذمی آمنا بالامان السابق سواء ترك بعض شعائر الاسلام اولا وسواء اعلن شعائر الکفر ولا ہمیں قول ثالث را محققیں ترجیح دادہ اند وبریں تقدیر معمولہ انگریز واشباہ ایشاں بلاشبہ دار الحرب است واللہ تعالی اعلم۔ (فتاوی عزیزیہ ص ۱۰۵ ج ۱ مجتبائی)

تحریر کیا گیا ہے کہ انگریز اور ان جیسی اقوام کی عملداری۔ دار الحرب ہوتی ہے یا نہیں۔ تو جاننا چاہئے کہ یہ قول تو مرجوح (ضعیف اور کمزور) ہے

کہ دارالاسلام کبھی دارالحرب ہوتا ہی نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ دارالاسلام دارالحرب ہو جاتا ہے۔ ہاں اس میں اختلاف ہے کہ کب ہوتا ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ اگر شعائر اسلام میں سے کوئی ایک چیز بھی ممنوع ہو جائے مثلاً اذان۔ ختنہ وغیرہ۔ تو دارالحرب ہو جاتا ہے۔ ایک جماعت کا قول ہے کہ دارالاسلام کے دارالحرب ہونے کا مدار شعائر اسلام کے محو ہو جانے اور مٹنے پر نہیں۔ بلکہ جب بھی کفر کے طریقے۔ بے دغدغہ اعلان کے ساتھ رواج پکڑ جائیں۔ دارالحرب ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اسلامی شعائر تمام کے تمام برقرار رہیں۔ تیسری جماعت نے اس سے بھی ترقی کی۔ اس کا قول یہ ہے کہ دارالحرب کی حد یہ ہے کہ اس میں کوئی مسلمان یا کوئی غیر مسلم (ذمی) سابق امن کے باعث مامون نہ رہے (بلکہ نیا عہد حکومت غیر مسلم سے کرنا پڑے) خواہ کچھ اسلامی شعائر باقی چھوڑے گئے ہوں یا نہ چھوڑے گئے ہوں۔ خواہ شعائر کفر کا اعلان کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔ اس تیسرے قول کو محققین نے راجح قرار دیا ہے۔ اور اس صورت میں جن **شہروں** میں انگریزوں اور ان جیسے کفار کی عملداری ہے **بلاشبہ دارالحرب ہیں۔**

جب کہ ہندوستان دارالحرب ہو گیا تو حامیان ملت کا سب سے پہلا فرض یہی تھا کہ ناموس وطن کی حفاظت کریں۔ وہ دارالاسلام کو پھر سے دارالاسلام بنائیں۔ اور علمار شریعت واقف ہیں کہ یہ فرض اپنے وقت میں نماز جیسی اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نماز کی

اہمیت اس فریضہ کے مقابلہ پر ثانوی درجہ میں پہنچ جاتی ہے۔

غزوۂ خندق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چند نمازیں قضا ہوگئیں۔ کیونکہ دنیا کے سب سے پہلے دارالاسلام یعنی مدینہ طیبہ پر کفار عرب کا نرغہ تھا۔ ایک روز ظہر سے مغرب تک اتنا موقعہ نہ مل سکا کہ نماز پڑھ سکیں۔ مجبوراً ان اوقات کی نماز قضا پڑھنی پڑی۔

مگر اہم سوال یہ تھا کہ اس اساسی اور سیاسی فرض کو کس طرح انجام دیا جائے۔

انقلاب کی اساسی تجویز

نظام حکومت کے متعلق مفصل نقشہ سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز۔ حجۃ اللہ البالغہ۔ اور بدور بازغہ وغیرہ میں مدون فرما چکے تھے ع

چھوٹے چھوٹے امرا۔ اور پھر ان پر خلیفہ اعظم۔ (فیڈریشن) قبائل۔ اور پھر صنعت کے لحاظ سے تنظیم۔ اور ان کا خلافت سے منسلک ہونا۔ وغیرہ۔ البدور البازغہ اور حجۃ اللہ البالغہ میں موجود ہے۔

ان تمام حکومتوں کا اساسی قانون شریعت غرا کو قرار دیکر نوع انسان کے لئے قانون ساز قوت حضرت حق جل مجدہٗ کو قرار دیا گیا ہے

آپ "منصب امامت" مصنفہ حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہید قدس اللہ سرہٗ العزیز کو ملاحظہ فرمائیے۔ ایک نئی حقیقت منکشف ہوگی۔ امامت کیا ہے۔ نظام حکومت کے لئے امیر کیسا ہونا چاہئے۔ اس تمام

ع سلطنت اور الطاف القدس اسی موضوع پر حضرت موصوف کی اساسی کتابیں ہیں

سلسلہ کا تعلق حضرت حق جل مجدہٗ سے کیا ہے - انبیاء علیہم السلام اس سلسلہ کی کونسی کڑی ہیں - یہ تمام چیزیں عجیب دغریب مجتہدانہ انداز سے بیان کی گئی ہیں - ہم اُن تمام کی تفصیل کریں تو کتاب کی ایک جلد اور بڑھ جائے -

بہر حال اسلامی سیاست یا ولی اللہی فلسفہ کی روشنی میں ایک اسکیم تیار کی گئی - جس کا اہم جز یہی تھا کہ ہندوستان کے نیم مردہ مسلمانوں میں جہاد اور آزادی کی روح پھونکی جائے -

ایران - افغانستان - چینی ترکستان اور بخارا دغیرہ کی منتشر مسلم حکومتوں کو ملا یا جائے - اور ہندوستان کو آزاد کرایا جائے - بالفاظ دیگر ان تمام ممالک کا ایک فیڈریشن بنا دیا جائے -

لیکن سوال یہ تھا کہ اس اسکیم کو نافذ کرنے کا بیڑا کون اٹھائے -

خود سیدنا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب بوڑھے ہو چکے تھے - دائم المرض تھے - بینائی اور صحت دونوں رخصت ہو چکی تھیں -

اس سیاسی تدبیر کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ تعلیمی نظام بھی قائم کر دیا جا - تاکہ اگر سیاسی اسکیم کامیاب نہ ہو سکے تو مسلمانوں کی مذہبی تعلیم برباد نہ ہو - اور اس کفرستان کے بسنے والے اسلام سے نابلد نہ ہو جائیں -

چنانچہ دو جماعتیں مرتب فرمائی گئیں - اور ان دونوں کے درمیان باہمی امداد و اعانت کا رابطہ قائم کر دیا گیا -

ایک جماعت کا فرض قرار دیا گیا کہ وہ پاؤں توڑ کر دہلی میں بیٹھے۔ تشنگان علوم کو سیراب کرکے دریا بدامن کرے۔ اور ہندوستان گلشن علم بنادے۔

سیدنا شاہ اسحاق صاحب رح اس جماعت کے سردار بنائے گئے حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب حضرت مولانا مفتی صدرالدین صاحب جیسے اکابر اس جماعت کے ارکان تھے۔ دہلی میں رہ کر تعلیم و تدریس افتار و اشاعت علوم ان کا فرض تھا۔ تزکیہ نفوس۔ ارشاد و تلقین ان اکابر کی گھٹی میں پڑا تھا۔ دوسرا فرض یہ تھا کہ دوسری جماعت کی حتی الوسع امداد کرتے رہیں۔

دوسری جماعت۔ حضرت سیدنا سید احمد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی زیر قیادت مرتب کی گئی۔ آپ فن سپہ گری کے ماہر تھے۔ پہلے گذر چکا ہے کہ نواب امیر خاں بانی ریاست ٹونک کے ساتھ کتنے ہی معرکے سر کیئے تھے۔ سالہاسال فوجی خدمات انجام دی تھیں۔

حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہید کی فطرت ہی فوجی اور سپاہیانہ واقع ہوئی تھی۔

آپ نے جہاد کی اہم ترین اور مشکل ترین خدمات کے لئے خود کو ابتدا ہی سے ہموار کر رکھا تھا۔

حضرت مولا عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کو بھی اس سلسلہ میں خاص مناسبت حاصل تھی۔

بہر حال ان حضرات کی ایک جماعت تیار کی گئی۔

اس جماعت کے متعلق دو کام تھے۔

(۱) تمام ہندوستان میں گشت کرکے مذہبی تبلیغ کا نظام قائم کرنا۔

(۲) جہاد اور سیاسی اسکیم کے لئے ہندوستان اور بیرون ہند میں جد و جہد کرنا۔ اس جماعت نے جس طرح اپنے فرائض انجام دئے اس کا مختصر بیان پہلے گزر چکا

ولائل (۱) آپ کو اس اسکیم کے الفاظ۔ جو احقر نے تحریر کئے ہیں بالکل نئے معلوم ہوں گے۔ کیونکہ وہ دور حاضر کی اصلاحات کے بموجب ہیں۔ مگر آپ خود مطالعہ فرما چکے ہیں کہ سید صاحب رح نے صرف ہندوستان اور سرحد کے مجاہدین پر قناعت نہیں کی۔ بلکہ مولانا نظام الدین صاحب چشتی کی سرکردگی میں کاشغر۔ بخارا۔ قندھار وغیرہ وغیرہ مسلم ریاستوں کے پاس سفارت بھیجی۔ جو ایک حد تک کامیاب رہی۔

اس کے علاوہ۔ آپ نے بہت سے مسلم فرمانرواؤں کو تحریک میں شرکت کی دعوت دی۔ ان کے پاس خطوط اور مراسلات بھیجے۔ جن کو آپ کے سوانح کی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔

سوانح احمدی میں آپ کے چند خطوط جمع کئے گئے ہیں۔ جو مندرجہ ذیل مسلم فرمانرواؤں کے پاس بھیجے گئے تھے۔

(۱) خانخانان خلجانی رئیس قلات (۲) شاہ محمود سلطان ہرات

(۳) شاہزادہ کامران (۴) امیر دوست محمد خاں والی کابل

(۵) شاہ بخارا (۶) سلطان زمان شاہ صاحب

(۷) سلیمان شاہ بادشاہ کاشغر (۸) حبیب اللہ خاں پسر عظیم خاں - برادر دوست محمد خاں والی کابل (وغیرہ وغیرہ)

(۲) لطف یہ ہے کہ ہندوستان میں سکھوں سے جہاد کا اعلان کیا جا رہا تھا - لیکن جو خطوط آپ تحریر فرماتے تھے اُن کا مضمون یہ ہوتا تھا جس کو کسی خط میں اختصار کے ساتھ اور کسی میں تفصیل اور طوالت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے -

ہر گاہ بلاد اہل اسلام در دست کفار لئام افتند - بر جمیع اہل اسلام عموماً و بر مشاہیر حکام خصوصاً واجب و موکد می گردد کہ سعی و کوشش در مقابلہ و مقاتلہ آنہا بجا آرند - تا وقتیکہ بلاد مسلمین را از قبضۂ ایشاں بر آرند - والا آثم و گنہگار می شوند و عاصی و ستمگار - وا ز درگاہ قبول مردود میگردند و از بارگاہ قرب مطرود -

بنائً علیہ چند روز در وطن خود اقامت نمودیم - بعد ازاں راہ ہجرت پیمودیم - و در بلاد ہند و سندھ و خراسان وغیرہ سیر گردیم وغیرہ -

سوانح احمدی ص ۱۹۰ مکتوب بنام شاہ بخارا -

اسی مکتوب میں چند سطور کے بعد تحریر ہے -

مقصود از برپا کردن تمام ایں معرکہ پیرائی - وعربدہ آرائی غیر

از اعلاءِ کلمۃ رب العالمین و احیاء سنت سید المرسلین و استخلاص بلاد مومنین از دست کفرہ متمردین چیزے دیگر نیست۔ و ہرگز ہرگز شعبہ وسوسہ شیطانی و شائبہ ہوائے نفسانی بایں داعیہ رحمانی و الہام ربانی مخلوط نہ گردیدہ۔ واللہ علی مانقول وکیل۔ ص۱۹۱ سوانح احمدی۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رح کے فتوے کو مطالعہ فرمائیے۔ اور پھر غور فرمایئے کہ کیا کفار لئام اور کفرہ متمردین صرف سکھ ہی ہونگے اور کیا اہل اسلام کے اُن ہی شہروں کا واپس لینا فرض ہوگا جو سکھوں کے قبضہ میں تھے۔ جو ممالک انگریزوں کے قبضہ میں تھے کیا اُن کا استخلاص اور اُن کی رہائی واجب نہ ہوگی؟

(۳) جس شخص نے سیدنا شاہ مولانا اسمٰعیل صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی تصنیف شریف "منصب امامت" کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ کبھی بھی باور نہیں کرسکتا کہ ان حضرات کے جہاد کا مقصد صرف سکھوں کو برباد کرنا تھا۔ انگریزوں سے اُن کو اطمینان تھا اور اُن کی حکومت پر یہ حضرات قانع تھے۔

انگریز تو درکنار حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز تو ایسے بادشاہوں کے مقابلہ پر بھی جہاد واجب قرار دے رہے ہیں جو ملحد مزاج اور زندیق طبع ہوں۔ دنیاوی نشیب و فراز ہی کو سعادت اور شقاوت تصور کرتے ہوں۔ حصول جاہ اور تحصیل مال کو اصل کمال تصور کرتے ہوں۔ اور اسی قسم کے دنیاداروں کو عاقل اور دانا تصور کرتے ہوں۔

انبیاء علیہم السلام کو بھی معاذ اللہ۔ جاہ طلب عقلاء۔ اور لیفارمر کی حیثیت دیتے ہوں۔ جنہوں نے محض سیاسی مصالح کی بنا پر مذہب کا ڈھونگ رچایا تھا۔ تاکہ نادانوں کو اس طرح پھانس کر حکومت قائم کرسکیں۔

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

تنبیہ رابع در بیان سلطنت کفر۔ باید دانست کہ مراد از سلطنت کفر دریں مقام حکومت کفار اصلی نیست۔ بلکہ مقصود ازیں سلطنتِ قومیست کہ جان خود را در زمرہ مسلمین می شمارند۔ و موجبات کفر صریح بعمل می آرند — واز ایشاں بہ نسبت احکام شرع آنقدر مخالفت وعناد صادر می شود کہ بر ایشاں حکم ارتداد ثابت می گردد۔ الخ صـ۹۶ منصب امامت۔

آخر میں فرماتے ہیں۔

پس ایں قسم سلاطین بلا شک از جنس کفار متمردین اند۔ وزنادقہ متمردین۔ جہاد بر ایشاں از ارکان اسلام است۔ واہانت ایشاں اعانت سید الانام (صلی اللہ علیہ وسلم) سلطنت ایشاں اصلا از جنس امامت حکمیہ نیست و نہ اطاعت ایشاں بوجہ من الوجوہ از اوامر شرعیہ صـ۹۷

اور پھر خاتمہ بحث پر ارشاد فرماتے ہیں۔

قیام سلطنت ارتداد بمشابہ غلبہ کفار ست۔ کہ بر ذمہ مسلمین

فرض عین مے شود۔ کہ بر وجہاد و قائم بگردانند۔ و ایں شورش و فساد شمشیر
بہ نشانند۔ وگرنہ توانند ازاں اقلیم ہجرت بگردانند و بدار الاسلام فرو آیند
صنہ ۹۔ منصب امامت۔

(۴) مشہور یہی ہے کہ سکھوں نے اذانیں بند کرادیں۔ مساجد شہید کرائیں۔ مگر افسوس کہ یہی شکایت حضرت شاہ عبد العزیز صاحب اپنے مذکورہ بالا فتوے میں انگریزوں کے متعلق بھی کر رہے ہیں۔

زیرا کہ مساجد را بے تکلف بدم می نمایند (مسجدوں کو بے تکلف شہید کردیتے ہیں)

(۵) آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ جیسے ہی نواب امیر خاں والی ٹونک نے انگریزوں کی دعوت صلح کو منظور کیا۔ حضرت سید صاحب اُس کی فوج سے الگ ہوگئے۔ اور اعلان کرگئے کہ کچھ دنوں بعد اپنی فوج کے پھریرے اڑاتا ہوا اس ملک سے گزروں گا۔

(۶) ہمیں اس مسئلہ پر سیاسی اور اقتصادی حیثیت سے بھی نظر کرنی چاہیے۔

بلاشبہ سکھ حکومت بھی مسلمانوں کے لئے کسی طرح اچھی نہ تھی۔ اور کچھ نہیں تو محض سکھ حکومت کا تصور ہی مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے کافی تھا۔ کیونکہ یہ جماعت ڈیڑھ سو سال پیشتر سے مسلمانوں سے نبرد آزما رہی تھی اور جب بھی موقعہ پاتی تھی مسلمانوں کی تباہی میں کوئی دقیقہ

نہ اٹھا رکھی تھی۔ لیکن مسلمان نتیجۃً غالب ہوتے رہتے۔ اب مغلوب ومحکوم جماعت کا غلبہ یہ ایک دوسرا تصور تھا جو مسلمانوں کی خودداری اور غیرت کو برانگیختہ کر سکتا تھا۔

(اور کیا تعجب ہے اسی جذبے سے فائدہ اٹھانے کے لئے حضرت سید صاحب نے سکھوں کے مظالم کو سامنے رکھا ہو)

لیکن با ایں ہمہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رنجیت سنگھ کی سلطنت شاہ زمان شاہ کا طفیل تھی۔ اسی نے اس کو پنجاب کی گورنری بخشی تھی جس کی بدولت (سلطنت زمان شاہ کے زوال وسقوط پر) رنجیت سنگھ نے مستقل سلطنت قائم کر لی۔

مسلمانوں کے دشمن پر مسلمان بادشاہ کی اس نوازش کو اگرچہ دور حاضر کے غلاۃ اور تنگ نظر مذاق کے لحاظ سے مسلم کشی سے تعبیر کیا جائیگا۔ لیکن مسلمان سلاطین اپنے مخالفین کو اسی طرح مطیع بنایا کرتے تھے۔ اگرچہ سات سو برس کی تاریخ ہندو راجاؤں کو یکسانیت کے ساتھ وفادار ثابت نہیں کرتی۔ مگر غداریوں کے مقابلہ پر مسلمان بادشاہوں کی فطرت یہی ہو گئی تھی کہ۔

ع در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست

ہمیں یہ حقیقت کبھی بھی فراموش نہ ہونی چاہئے کہ چالیس سالہ سکھوں کی حکومت مسلمانوں کے مالی اقتصادی، صنعتی اور تعلیمی وقار پر کچھ بھی اثر

اندازہ نہ ہو سکی۔ حتیٰ کہ سکھوں کی حکومت کے اختتام کے بعد بھی انگریزی افسروں کی رپورٹوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ

(الف) اس عرصہ میں اگرچہ حکومت سکھوں کی رہی۔ مگر زمینداری مسلمانوں کی تھی۔ ہندو اُن کے ہاں کارندوں کی طرح کام کرتے تھے۔ (ملاحظہ ہو مسلمانوں کے افلاس کا علاج۔ یعنی رپورٹ مرتب کردہ ایجوکیشنل کانفرنس مطبوعہ ۱۹۲۴ء ص۴۸)

(ب) تعلیمی میدان پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔
ہندوؤں کے بچوں کو مسلمان استادوں ہی پر اعتماد تھا۔ اور وہ اُن کے پاس ہی شوق سے پڑھتے تھے (حکومت خود اختیاری ص۹۹)

(ج) صنعت پر مسلمانوں کا قبضہ بدستور رہا۔ چنانچہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں مسلمان توپیں بناتے تھے۔ اور ان پر تاریخ اور ساخت کا سنہ اور کارخانہ وغیرہ کا نام عموماً فارسی میں ہوتا تھا۔ ملاحظہ ہو تاریخ پنجاب مصنفہ منشی عبدالکریم ارص ۱۶۳ تا ۱۶۴ جس میں ۳۸ توپوں کا تذکرہ ہے۔
ایک توپ پر حسب ذیل دو شعر درج تھے۔

جمعدار ایں توپ شد رنجیت سنگھ	کہ در جانفشانیست او بیدرنگ
بموجب صلاح لالہ نیسنگھ بار	غلام نبی گفت تاریخ دار

ایک توپ پر یہ عبارت درج تھی
ہٰذا الضرب موسومہ مجنون۔ حسب الامر اشرف۔ اقدس اعلیٰ حضور انور

تاریخ پنجاب ص۴۶ !!

در سنبت ۱۸۹۶ء باہتمام صاحب ارسطو فطرت۔ فلاطون زماں موشیو شوالیر جنرل کورٹ صاحب بہادر در عیدگاہ بحسن خدمت فضل علی کمیدان شاگرد صاحب ممدوح ریختہ شد[1]

(د) حکومت میں بیشتر دخل فارسی زبان اور فارسی رسم الخط کو تھا

(ہ) ۱۸ فروری ۱۸۰۶ء کو سکھ حکومت کا انگریزوں سے معاہدہ ہوا تو گلاب سنگھ وزیر کی زیر قیادت جس جماعت نے انگریزوں سے گفتگو کی اس میں منجملہ دس ارکان کے چار مسلمان تھے۔ فقیر نورالدین فقیر تاج الدین۔ فقیر چراغ الدین۔ سردار سلطان محمد خاں (تاریخ پنجاب)

سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کے اقتصادی اور معاشی حقوق برطانیہ کے زیر سایہ محفوظ رہ سکتے تھے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم بنگال کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔ جہاں تقریباً ستر سال پیشتر سے انگریزی تسلط موجود تھا۔ وہ تمام تباہی جو انگریزی اقتدار کے ماتحت مسلمانوں پر آئی اسکی داستان بہت طویل ہے۔ اس کا کچھ حصہ پہلے حصوں میں گذر چکا ہے کچھ تذکرہ آئندہ آئیگا (انشاء اللہ) ذیل کی تحریر سے اس تمام جدو جہد کا مجمل نقشہ سامنے آجاتا ہے جو مسلمانوں کو پیسنے کے لئے اس عرصہ میں مسلسل کی جاتی رہی۔

سر ولیم ہنٹر نے ۱۸۰۹ء میں یعنی ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت سے صرف گیارہ سال بعد بنگال کے متعلق لکھا تھا۔

---

[1] تاریخ پنجاب ص۴۲ و ۴۳ مصنفہ منشی عبدالکریم صاحب

مسلمان اب اسقدر گر گئے ہیں کہ اگر وہ سرکاری ملازمت پانے کی قابلیت بھی حاصل کر لیتے ہیں تب بھی انہیں سرکاری اعلانات کے ذریعہ سے خاص اختیار کے ساتھ روک دیا جاتا ہے۔ اُن کی بیکسی کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ اور اعلیٰ حکام تو اُن کے وجود کو تسلیم کرنا بھی اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ حکام کے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلکتہ میں مشکل سے کوئی دفتر ایسا ہوگا کہ جس میں بجز چپراسی یا چٹھی رساں یا دفتری کے مسلمان کو کوئی نوکری مل سکے۔[1]

سوال یہ ہے کہ کیا حضرت سید صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب شہید رح کو علم نہ تھا کہ میسور میں سلطان ٹیپو کو۔ بنگال میں سراج الدولہ کو اور پھر میر جعفر اور میر قاسم کو۔ لکھنؤ میں شجاع الدولہ کو۔ روہیلکھنڈ میں حافظ رحمت خاں کو کس طرح برباد کیا گیا۔ اور کس طرح کمپنی کے ظالم اور سفاک ہاتھوں نے بنگال کی عام خوشحالی کو افلاس سے بدلا۔ کس طرح بنگال جیسے باغِ ارم کو دوزخ کا نمونہ بنایا گیا۔ کس طرح وہاں کی صنعت و تجارت کو تباہ کیا گیا۔ کس طرح زمینداریوں کا خاتمہ کیا گیا۔ اور کس طرح اسکولوں میں انجیل ٹھونس کر مذہب کو فنا کیا گیا۔ اور تعلیم کا یہ منشا قرار دیا گیا کہ "رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی رہیں۔ اور خیالات و جذبات کے

---

[1] مسلمانوں کے افلاس کا علاج ص۱۲ مرتبہ ایجوکیشنل کانفرنس۔

اعتبار سے انگریز ہو جائیں۔ پھر کس طرح فارسی کے بجائے انگریزی کو سرکاری زبان قرار دیکر مسلمانوں کی سربلندی کو سرنگوں کیا گیا۔

یہ تمام واقعات وہ تھے جو عزم جہاد سے بیشتر رونما ہو چکے تھے۔ اور جنہوں نے عام ہندوستانیوں کے دلوں میں نفرت اور غصہ کے جذبات بھر دئے تھے۔ جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں آتش فشانی کی۔

فیصلہ اس قسم کے بہت سے دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں جن کا قطعی فیصلہ یہی ہے کہ حضرت سید صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اور آپ کے رفقا کا اصل مقصد انگریزوں پر حملہ اور اُن کے پنجہ استبداد سے ہندوستان کو نجات دلانا تھا۔ لیکن مندرجہ ذیل وجوہات وہ ہیں جنہوں نے اس مقدس جماعت کو اس قدر یہ اور اس پالیسی پر مجبور کیا کہ انگریزوں کی حکومت سے سردست دوستی اور وفاداری کا اعلان و اظہار کرتے رہیں۔ تاکہ۔

(الف) عام مسلمانوں میں جہاد اور ایثار کی روح آسانی سے پھونکی جا سکے۔ اور ہندوستان سے مجاہدین کی ایک مخلص فوج تیار کی جا سکے۔

(ب) مجاہد جماعت کے لئے سب سے مقدم پناہ گاہ کی تلاش ہے۔ جب تک کوئی پناہ گاہ نہ ہو شریعت کے لحاظ سے جہاد واجب ہی نہیں ہوتا۔ قرآن حکیم میں پناہ گاہ کو "حذر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس کے متعلق ارشاد ہے۔

خذوا حذرکم ثم انفروا   پناہ گاہ بنالو۔ پھر کوچ کرو۔

مقصود یہ ہے کہ جہاد اور جہاد کے لئے نقل و حرکت سے حذا اور پناہ گاہ کا انتخاب اور اُس کی مضبوطی فرض کی گئی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاد کی اجازت اُس وقت دی گئی جب مدینہ طیبہ۔ دار الاسلام اور پناہ گاہ اہل اسلام بن چکا تھا۔

آپ سارے ہندوستان کا نقشہ سامنے رکھیں تو بآسانی اندازہ ہو جائے گا کہ تبت اور نیپال کی پہاڑیوں یا شمالی مغربی کوہستان کے سوا کوئی جگہ اس قسم کی انقلابی جماعت کے لئے پناہ گاہ نہیں بن سکتی۔

مگر نیپال کی پہاڑیاں حضرت سید صاحب کو کوئی امداد نہیں پہنچا سکتی تھیں۔ نیپال سے گذر کر آج تک کوئی فاتح ہندوستان میں نہیں آیا۔ صرف تاریخ ہند کی ابتدا میں کچھ قوموں کی آمد اس راستہ سے ہندوستان میں بتائی جاتی ہے۔ مگر اول تو اس تاریخ کا اعتبار نہیں۔ علاوہ ازیں یہ ضروری نہیں کہ ہزارہا سال پیشتر بھی اس علاقہ کی وہی حالت ہو جو موجودہ دور یا گذشتہ صدیوں میں رہی ہے۔

بہرحال پناہ گاہ بنانے اور مقرر کرنے تک کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا کہ انگریزوں سے اعلان جہاد کر دیں۔

لیکن چونکہ اعلان جہاد کے بغیر مجاہدین کا اجتماع بھی نہ ہو سکتا تھا لہٰذا سکھوں سے جہاد کا اعلان کیا گیا۔

(ج) تاریخ انگریز سے جو واقف ہے۔ وہ بخوبی جانتا ہے کہ کس وجالاکی طور پر میر جعفر کو سراج الدولہ کے مقابلہ پر نظام حیدر آباد کو سلطان ٹیپو کے مقابلہ پر شاہزادہ

کو مرہٹوں کے مقابلہ پر۔ پھر مرہٹوں کو شاہزادہ کے مقابلہ پر۔ شاہ زمان۔ والی کابل کی رعایا کو (جب کہ وہ انگریزوں کا قلع قمع کرنے کے لئے ہندستان پہنچا ہوا تھا۔ اور لدھیانہ تک پہنچ چکا تھا) خود اپنے بادشاہ کے مقابلہ پر شجاع الدولہ کو حافظ رحمت خاں کے مقابلہ پر بھڑکایا گیا اور کس طرح آپس میں جنگ کرا کر برباد کن ثالث بنے اور یا کسی ایک کی حمایت کر کے دوسرے کو تباہ کیا۔

لہذا اگر برطانوی علاقہ میں رہتے ہوئے انگریزوں سے جہاد کا اعلان کیا جاتا۔ تو نہ معلوم کتنے میر جعفر اور کتنے میر قاسم ہندوستان کے چپہ چپہ سے پیدا ہو جاتے اور پہلے ہی دن اس تحریک کو وہ دن دیکھنا نصیب ہوتا جو کچھ عرصہ کے بعد اس کے نہیں خبیث ہاتھوں کے ذریعہ سے مقدر ہو چکا تھا۔

(د) حقیقت یہ ہے کہ انگریز کی سیاست اس وقت سکھ حکومت کو ایشائی مسلم حکومتوں کے لئے اسی طرح آڑ بنائے ہوئے تھی جیسے وہ روس سے جان بچانے کے لئے افغانستان اور ایران کو آج تک آڑ بنائے ہوئے ہے۔ اور جس طرح یورپ کی طاقتوں نے یورپ کے مرد بیمار یعنی ترکی حکومت کو ایک عرصہ تک کے لئے آڑ بنائے رکھا تھا۔

افغانستان اور ایران کی وہ طاقتیں جو ہمیشہ ہندوستان پر حملہ آور ہوتی رہیں اور یکے بعد دیگرے اس کو اپنا وطن بناتی رہیں۔ اب بھی پایہ تخت دہلی تک پہنچکر انگریز کو ختم کر سکتی تھیں۔

مگر انگریز نے اپنی ابتدائی کمزوریوں کے دور کرنے تک۔ سکھ حکومت کو آڑ بنانا ضروری سمجھ رکھا تھا۔ بلاشبہ انگریز خود ہی سکھوں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ مگر اپنے پاؤں جما لینے کے بعد۔ یہ وقت بہت ہی بہتر تھا کہ اس آڑ کو راستہ سے ہٹا کر انگریز کو پاؤں جمانے کا موقعہ نہ دیا جاتا۔ لہٰذا انگریز کو خود ہندوستان سے اکھاڑنے کے لئے بہترین چارہ یہی ہو سکتا تھا کہ اس دیوار کو منہدم کر دیا جائے۔ تاکہ دوسری طاقتیں آسانی سے دہلی تک یورش کر سکیں۔ لہٰذا قدرتی طور پر سکھوں کے فنا کرنے کے معنے یہی ہوتے تھے کہ انگریز کو فنا کیا جائے۔ اور انگریز کو فنا کرنے کے لئے سکھوں کا مٹا دینا کافی تھا۔ اس لئے اگر سید صاحب اپنا ارادہ صرف اتنا ہی رکھتے کہ سکھوں کو برباد کر دیں تب بھی اُس کے معنی انگریز کو برباد کرنا تھے۔

اور اس صورت پر حضرت سید صاحب کے وہ تمام اعلانات بجا ہو جاتے ہیں کہ ہمیں صرف سکھوں سے مقابلہ کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خاردار تار اگر راستہ سے ہٹ جائے تو پھر کابل اور ایران کی منتشر طاقتیں بھی ہندوستان کو خالی نہ چھوڑیں۔

نتیجہ بہرحال اس قسم کی مختلف وجوہات تھیں جنہوں نے حضرت سید صاحب کو اس اعلان پر مجبور کیا۔

انگریزی ڈپلومیسی اور سید صاحب کی شکست

کیا کوئی تصور کر سکتا ہے کہ شمالی سرحدی علاقوں میں سید صاحب کی حکومت کا قیام انگریز کے لئے کسی صورت سے بھی گوارا ہو سکتا تھا؟ انگریز اور شاطر انگریز۔ مکار اور دغا باز انگریز۔ جو ہمیشہ آپس میں لڑا کر اپنا الو سیدھا کرتا رہا۔ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھا۔ مگر وہ خوش تھا کہ یہ بلا اس کے مقبوضہ ممالک سے ٹل رہی ہے۔ چنانچہ ان مجاہدین کی مقدس جماعت سرحد پہنچی۔ وہاں کے باشندگان نے بڑی حد تک سید صاحب کا خیر مقدم کیا۔ اور آپ پڑھ چکے ہیں کہ تقریباً ایک لاکھ تک جمعیت حضرت سید صاحب کے گرد جمع ہو گئی۔

مگر کیا گزری ہو گی انگریز کے دل پر اس وقت جب وہ سن رہا ہو گا کہ سید صاحب کی طاقت شمالی مغربی ہند میں روز افزوں ہے۔ اور وہ شیر پھر اپنے پنجے درست کر رہا ہے۔ جس کو انگریز نے ڈیڑھ سو برس کی متواتر جد و جہد کے بعد نیم مردہ کیا تھا۔

تم نے پڑھا کہ سید صاحب کو عین اس زمانہ میں زہر دیا گیا کہ جب آپ کی کمان کے نیچے ایک لاکھ کا مجمعہ ہو گیا تھا۔ اور پھر عین معرکہ جنگ میں ایک جماعت سید صاحب کی فوج سے الگ ہو کر چلی گئی۔ تم نے موجودہ دور سے دس سال پیشتر یہ بھی دیکھا کہ امان اللہ خاں شاہ افغانستان کو کس طرح بدنام کیا گیا۔ کس طرح ملکہ "ثریا بیگم" زوجہ

عہ یعنی ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۹ء ۱ ۵ ۵

امان اللہ خاں) کے فرضی فوٹو۔ (خلاف شرع حالت کے) سرحدی قبائل ور افغانستان میں تقسیم کرائے گئے۔ اور کس طرح اہل ملک کو اپنے مدبر اور ہونہار۔ غیور اور بہادر نوجوان اور ہردلعزیز بادشاہ سے ورغلاکر بغاوت پر آمادہ کیا گیا۔

کرنل لارنس کی تاریخ آپ کو یاد ہوگی۔ کس طرح وہ زاہد متقی۔ پرہیزگار اور پیر و مرشد بنکر سرحدی قبائل میں پہنچا۔ اور کس طرح اُن کو برانگیختہ کیا۔

کس طرح بچہ سقہ جیسے نامعلوم انسان کو اٹھایا گیا اور کابل کے تخت پر بٹھاکر دنیا کی تاریخ میں مضحکہ خیز حقیقت کا اضافہ کیا گیا۔

تمہیں معلوم نہیں کہ کس طرح کروڑہا بلکہ تقریباً ایک ارب روپیہ (جیساکہ سنا گیا ہے) انقلاب افغانستان کے لئے پانی کی طرح بہایا گیا۔

تو تمہارا کیا خیال ہے کہ اس دجال قوم نے حضرت سید صاحب کے ساتھ کیا کیا ہوگا۔

اُن کی جمعیت کو منتشر کرنے کے لئے کس طرح روپیہ بہایا گیا ہوگا اور کس کس طرح سید صاحب کو بدنام کیا گیا ہوگا۔

لفظ "وہابی" کی ایجاد

حیران ہو جاؤ گے جب حقیقت ہیں نگاہ سے سید صاحب اور حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہید کے حالات معلوم کرنے کے بعد یہ سنو گے کہ یہ وہابی تھے۔

انگریز ہمیشہ غلط جذبات سے کھیلا کرتا ہے۔ وہ بے وقوفوں کو احمق بنا کر اپنا الو سیدھا کیا کرتا ہے۔

اس نے عربوں کو آزاد حکومت کا چکمہ دیکر ترکوں سے باغی کیا فلسطین کو مستقل حکومت کا سبز باغ دکھا کر عین میدان جنگ میں ترکوں کے مقابلہ پر کھڑا کر دیا۔ اور خاص انہیں دنوں میں یہودیوں سے معاہدہ کر کے ۱۷ ارب پونڈ لیکر فلسطین کی ارض مقدس ان کے ہاتھوں بیچدی۔

اب یہودی اور مسلمان دست گریبان ہیں

انگریز اپنے غلام ممالک کے غلاموں کو بھیج کر ان عاشقان حریت کی سر کوبی کر رہا ہے۔

جب کہ فلسطین کے آزادی طلب مجاہدین

کو اس طرح برباد کیا جا رہا ہے ہندوستان کے جان و مال کے تحفظ سے دل نازک پراگندہ ہے۔

بہت زیادہ تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ مخلوط انتخاب سے

مسلمان تباہ ہو جائیں گے۔ ہندو اکثریت مسلمانوں کی معاشرت برباد کر دیگی۔ وغیرہ وغیرہ

بہرحال حضرت سید صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے زمانہ میں جب جوش جہاد شباب پر تھا۔ تو شدید ترین خطرہ محسوس کیا گیا کہ سرحد کے پاک اور برگزیدہ مسلمانوں کے عقاید بالکل برباد ہو جائیں گے۔ کیونکہ سید احمد صاحب اور حضرت شہید مولانا محمد اسمٰعیل صاحب وہابی ہیں۔

اس الزام کی لغویت تو ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔ اور واضح کر چکے ہیں۔ کہ ان حضرات کا سفر حج اُس زمانہ میں ہوا تھا جب کہ حجاز مقدس میں عبدالوہاب کے ہمنوا اور پیروؤں کا نام و نشان بھی باقی نہ تھا۔ اور نہ صرف حکومت ترکی بلکہ حجاز مقدس کے سارے عرب اُن کے نام سے بھی متنفر تھے۔

لیکن حق و صداقت اور عقل و فہم کے ہر ایک تقاضے سے آزاد ہو کر اس الزام کو حضرت سید صاحب کے سر تھوپا گیا۔ اور مفتوحہ علاقہ کے باشندگان کو سید صاحب سے یہاں تک متنفر کیا گیا۔ کہ ایک ہی شب میں سیکڑوں مجاہدین کو مختلف مقامات پر شہید کر دیا گیا۔

سوال یہ ہے کہ "وہابی" کے لفظ کا موجد اور اس پروپیگنڈے کا ذمہ دار کون تھا۔

اس وقت "حیات طیبہ" مصنفہ مرزا حیرت صاحب دھلوی مطبوعہ ثنائی برقی پریس ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۹۴۲ء کا صفحہ ۲۲۹ ہمارے سامنے ہے جس میں مرزا صاحب اپنے خیال کے بموجب مذہب اہل حدیث کی خوبی

بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

اب میں مفصلۂ ذیل یورپینس (یورپین مصنفین) کی کتابوں سے مولانا شہید اور سید صاحب اور محمدی مذہب (جسے غلطی سے وہابیہ مذہب سے پکارا گیا ہے۔ اُس کی نسبت کچھ طول طویل آرا رکا خلاصہ کرتا ہوں)۔ جو یقیناً بہت ہی دلچسپ ہوگا۔

(۱) برک ہرڈس۔ بدوینس اینڈ وہابیز۔
برک ہرڈس صاحب کا بیان۔ بدو اور وہابیوں کے متعلق۔

(۲) براجیز بریف ہسٹری آف وہابیز۔
وہابیوں کی مختصر تاریخ مصنفہ براج۔

(۳) سرلیوس پلیس پولٹیکل مشن ٹو نجد۔
سرلیوس پلیس کی پولٹیکل سفارت نجد میں۔

(۴) ہنٹرس مسلمان آف انڈیا۔ (مسلمانان ہند مصنفہ ہنٹر صاحب)

(۵) پیلگریوس۔ سنٹرل اینڈ۔ ایسٹرن عربیا۔
(پیلگریو کی کتاب وسطی اور مشرقی عرب کے بیان میں)

(۶) لیڈی انس بلنٹس پلگیریج ٹو نجد۔
(بیگم انس بلنٹس کا سفر نجد۔

(۷) دی آر بیڈجرس امام اینڈ سیا آف ادمان۔
(دی آر بیڈ کی کتاب ادمان کے سیدوں اور اماموں کے بیان میں)

(۸) پیلنٹس لیوچر آف اسلام (پیلنٹس صاحب کی کتاب اسلام کا مستقبل

مذکورہ بالا کتابوں میں سے جو بہت جوش و خروش سے انگریزی میں اناپ شناپ تصنیف کی گئی ہیں اور جن میں زیادہ تر مصنفوں نے اپنے خیالات کو ورک دیا ہے۔ اور خواہ مخواہ بیچارے محمدیوں کو خوفناک صورت میں دکھایا ہے۔ یہاں کچھ تذکرہ کیا جاتا ہے جس سے ہندوستان کے مسلمان واقف ہوں کہ ان کے دوست مسیحیوں کا خیال ان کی نسبت کیا ہے؟؛

مذکورہ بالا تصانیف کا خلاصہ:

' اگرچہ وہابیوں کی جنگی اور ملکی قوت چکنا چور ہو گئی۔ اور سعد کی خاندان کی حکمرانی کی حدود نجد میں محدود ہو کر رہ گئیں۔ مگر پھر بھی وہ اصول مذہبی جو محمد بن عبدالوہاب نے بنائے تھے۔ ابتک مساجد میں نہایت مذہبی جوش میں بیان کئے جاتے ہیں۔ اور ان پر خوب دھوم دھام سے وعظ ہوتے ہیں۔ اِن جوشیلے واعظوں کی گونجیں حدود نجد ہی میں مقید نہ رہیں۔ بلکہ اُنہوں نے ہندوستان کے ایک بزرگ کی بے آرام روح میں مذہبی دلولے کی نئی روح پھونک دی۔ جب یہ بزرگ مکہ شریف کے حج کو آیا تو اس نے وہابیوں کے بڑے فاضل سے وہابی مذہب کی تعلیم حاصل کی۔ اور محمد بن عبدالوہاب کے اسلامی اصول کو خوب مانجھا

سید احمد رائے بریلی کے قزاق اور رہزن نے سنہ ۱۸۲۲ء میں حج بیت اللہ کر کے چاہا کہ شمالی ہند کو یکلخت وہابی اصول منوا دوں۔ پیغمبر اسلام کے براہ راست سلسلہ اولاد میں ہونے سے (برخلاف وہابیان

نجد کے، اس نے اپنے میں امیرالمومنین بننے کی ضروری صفات ملاحظہ کیں
مسلمانان ہند نے اسے سچا خلیفہ یا مہدی تسلیم کرلیا۔ انگریزی حکام کی ناک
میں وہ ہمارے صوبوں میں گشت لگاتا پھرا۔ اور بے شمار لوگوں کو اپنا
معتقد بنالیا۔ اس نے اپنے کارندے پٹنہ میں مقرر کئے اور پھر دہلی کی طرف
رخ کیا۔ یہاں خوش قسمتی سے ایک بڑا مولوی۔ محمد اسمٰعیل، اس کا مرید
ہوگیا۔ اور آخر میں اپنے پیر کا ایسا والہ اور شیدا ہوا کہ اس نے
خلیفہ کے اصول مذہبی کی ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام صراط مستقیم ہے
۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو اس نے سکھوں کے خلاف جہاد کا جھنڈا بلند کیا۔ وسط
وسط ایشیا کو اپنے ساتھ ہم زبان کرنے کی کوشش کی۔ حدود پشاور اور
پشاور میں اس نے قیامت برپا کردی۔ اور رنجیت سنگھ پر رات کی
نیند اور دن کا آرام حرام کردیا۔ جہادی جنگیں چار برس تک ہوتی رہیں
جن میں سید احمد ہی کو متواتر کامیابی ہوتی رہی۔ اب وہابیہ لشکر کی قوت
اور بھی خوفناک ہوگئی تھی۔ اور وہ (گئی) اور بھی بڑھ گئی۔ مگر اپنے سردار
کے ایک عظیم الشان جنگ میں، جو شیر سنگھ سے بالاکوٹ ہزارہ میں ہوئی
تھی۔ ماہ مئی ۱۸۳۱ء میں قتل ہونے سے رک گئی۔ [illegible] یافتہ لشکر
کا بقیہ حصہ حدود سے عبور کرکے "ستیانا" میں جاکر آباد ہوگیا۔ ۱۸۶۳ء
کی جنگ میں برٹش گورنمنٹ نے ان کا بالکل فیصلہ کردیا۔ [illegible]
۳ سو وہابی دریائے انڈس کے کناروں پر چھوٹی چھوٹی آبادیں ہیں جن کا
سردار مشہور ۱۸۵۷ء کا بانی شیخ عبداللہ ہے جو ایک بہت ضعیف شخص ہے

جس نے حال ہی میں اپنی لڑکی کی شادی سابق امام پشاور سے کر دی ہے۔
اس شادی کی وجہ یہ ہے کہ بلوچی کا وہابیہ اثر حدود پشاور پر محیط ہو جائے
سنہ ۲۳ ۔ حیات طیبہ۔

اس کے بعد سید صاحب کے متعلق وہی غلط اور مسخ شدہ خیالات منسوب کئے گئے ہیں جن کو مخالفین پیش کرتے ہیں۔

بہر حال جس طرح حضرت سید صاحب اور حضرت شہیدؒ کی قربانیاں قابل صد تحسین ہیں اور ساری امت سے خراج عقیدت وصول کر رہی ہیں اسی طرح ہم مجبور ہیں کہ تاج برطانیہ کو بھی اُس کی کامیاب ڈپلومیسی پر مبارکباد دیں۔ ع "گو مشت خاک ما ہم بر باد رفتہ باشد"

ان حضرات کے حریم اطہر پر۔ وہابیت اور معاذ اللہ بد دینی کے غلط الزامات کی غلاظت اتنی ڈالدی گئی ہے۔ کہ مخالف تو مخالف موافق اور مخلصین بھی اصل مقصد سے ناآشنا ہو کر اسی غلاظت میں پھنس گئے۔ آج یہ نہیں معلوم کہ خون مظلومیت کے کھولتے ہوئے فوارے جوان مجاہدین ملت کے پاک جسموں سے بالاکوٹ کی پہاڑیوں میں بہتے تھے اُن کا مقصد کیا تھا؟

ہاں اپنے اور پرائے اس دُھن میں مصروف ہیں کہ یہ مسلمان بھی تھے

یہ ہی انگریزی ڈپلومیسی کا ایک ادنیٰ کرشمہ۔ جو ہمارے لئے کتنا ہی تباہ کن کیوں نہ ہو مگر انگریزی کی نجات اور اس کی صدسالہ ترقی و برتری

کا ذریعہ بن گیا۔ اے کاش ابدالی لوگ سمجھیں

پسماندگان پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت سید صاحب کی شہادت کے بعد شیخ ولی محمد صاحب پھلتی۔ سید صاحب کے حرم کو لیکر ٹونک پہنچے۔ یہاں سید صاحب کی دوسری ازواج موجود تھیں کا شغر والی بی بی سے جنگ بالاکوٹ سے چند دن پہلے ایک صاحبزادی پیدا ہوئی تھیں۔ نواب وزیرالدولہ والی ٹونک نے ان کی اس درجہ عزت کی کہ ان کی پالکی کو دور سے خود اٹھا کر شہر میں لائے۔

سید صاحب کی دو صاحبزادیاں تھیں۔ ایک سارہ اور دوسری ہاجرہ۔ نواب وزیرالدولہ نے بڑی کے نام بارہ ہزار کی جاگیر اور چھوٹی کے نام اس سے کچھ قدر کم جاگیر مقرر کردی۔

ان صاحبزادیوں کی اولاد اب تک ٹونک میں موجود ہے۔

حضرت مولانا شاہ محمد اسمعیل صاحب آپ کے ایک فرزند ارجمند تھے جن کا اسم گرامی۔ شاہ محمد عمر تھا۔ یہ مجذوب تھے۔ ان کی مجذوبانہ حکایات ارواح ثلاثہ میں درج ہیں۔ آپ کے بلند مرتبہ کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ مشہور یہ تھا کہ حضرت شاہ محمد عمر صاحب کو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت زیارت ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ مفتی صدرالدین صاحب اور امام صاحب جامع مسجد دہلی اور کچھ اور حضرات نے اصرار کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہمیں بھی کرا دیجئے۔ شاہ صاحب نے انکار فرمایا۔ مگر ان حضرات نے اصرار برابر جاری رکھا۔ ایک شب کو مفتی صاحب نے خواب میں دیکھا کہ سید الکونین صلے اللہ علیہ وسلم جامع مسجد کے ممبر پر

تشریف فرما ہیں اور شاہ محمد عمر صاحب مو رچل ٹہل رہے ہیں۔ اور فرمارہے ہیں کہ "صدر الدین آؤ۔ رحمۃ عالم (صلے اللہ علیہ وسلم) کی زیارت کر لو۔
لطیفہ یہ ہوا کہ اسی شب کو بعینہ یہی خواب امام صاحب اور تمام درخواست کرنے والوں نے دیکھا۔
صبح کو ہر ایک شخص چلا کہ دوسرے سے اس خواب کو بیان کرے ابتک کوئی دوسرے کے مکان پر نہیں پہنچنے پایا تھا کہ راستہ میں سب کی ملاقات ہو گئی یہ بھی عجیب اتفاق تھا۔
اب سب مولانا محمد عمر صاحب کے در دولت کی طرف چلے۔ وہ مکان سے باہر ٹہل رہے تھے۔ ان حضرات نے خواب بیان کیا۔ فرمایا نہیں میں ایسا نہیں اور نہیں نہیں کرتے ہوئے بھاگ گئے۔
ایک مرتبہ ایک صاحب نواب مصطفےٰ خاں صاحب اور مرزا غالب بالاخانہ پر بیٹھے تھے۔ بلا مزامیر کے گانا ہو رہا تھا۔ مومن خاں کہیں سے مولانا محمد عمر صاحب کو پکڑ لائے۔ وہ کہہ رہے تھے مجھے چھوڑ دو۔ مگر ان کو زبردستی لے آئے۔ آ کر بیٹھ گئے۔ گانا پھر شروع ہو گیا۔ مولانا محمد عمر صاحب نے ایک مرتبہ خفیف سی حرکت کی۔ سارا مکان ہل گیا۔ یہ حضرات سمجھے زلزلہ آیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد دوبارہ حرکت کی۔ پھر مکان پہلے سے زیادہ ہلنے لگا۔ تیسری مرتبہ پہلے سے زیادہ حرکت کی۔ تو اب کی مرتبہ اتنا ہلا کہ کڑیاں بھی چرچرانے لگیں۔ تب یہ حضرات پریشان ہو کر کہنے لگے۔ شاہ صاحب یہ کیا۔

شاہ صاحب نے فرمایا۔ میں پہلے ہی کہتا تھا کہ چھوڑ دو۔ کہہ کر روانہ ہو گئے۔

ایک مرتبہ رات کو کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ پہرہ والے نے ڈانٹا۔ "کون جاتا ہے"۔

شاہ صاحب خاموش رہے۔ اس نے دوبارہ پوچھا۔ شاہ صاحب فرمانے لگے "تجھے معلوم نہیں ہوتا آفتاب نکلا ہوا ہے"۔

اس جواب پر پہرہ والے نے مارنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے کوئی جاننے والا بھی آ گیا۔ اس نے پہرہ والے کو روکا تب تو پہرہ والا بھی متعجب ہو کر شاہ صاحب سے معذرت کرنے لگا۔ کہ حضرت میں نے پہچانا نہیں تھا۔

شاہ صاحب نے فرمایا۔ کچھ نہیں میاں کچھ نہیں۔ اور چلے گئے۔
(ص۱۱۹ تا ص۱۲۰ ارواح ثلاثہ)

خاندان ولی اللہی کے باقی حضرات

حضرت مولانا شاہ اسحٰق صاحب و مولانا یعقوب صاحب

و سیدنا حضرت شاہ عبدالغنی صاحب قدس اللہ اسرارہم

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے

سیدنا حضرت شاہ محمد اسمٰعیل صاحب اور آپ کے پیر و مرشد یعنی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے خلیفۂ ارشد حضرت مجدد طریقت سیدنا سید احمد صاحب بریلوی قدس اللہ سرہم العزیز اپنے دل کی حسرت پوری کر چکے۔ ابدی حیات حاصل کر چکے۔

فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ کی یاد تازہ کرتے ہوئے۔ بارگاہ رب صمد میں سرخروئی حاصل کر چکے۔ غیر مسلم حکومت کے مقابلہ میں جو فریضہ تھا اس کو ادا کر چکے۔

رضاء الٰہی کی بے پایاں نعمتوں سے ہم کنار ہو چکے۔

لیکن جو اکابر ملت زندہ تھے۔ ان کے دلوں پر کیا گذری؟ اُن کی خاموش تمنائیں کس طرح حسرت و یاس کی نذر ہوئیں۔؟ بہت مشکل ہے

کہ اُس کی تشریح کی جائے۔

ہاں اتنا معلوم ہے کہ ہر دو شہداء کی شہادت سے تقریباً بارہ سال بعد ۱۲۵۸ھ ہجری میں مولینا حضرت شاہ اسحاق صاحب اور مولینا حضرت شاہ یعقوب صاحب نے اپنے متعلقین اور متوسلین سمیت دیارِ ہند کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ اور حرم پاک کو اپنا نشیمن بنا لیا۔

کہہ سکتے ہو کہ سیدنا حضرتِ شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے فتوے کا (ہندوستان دارالحرب ہے) دوسرا عملی پہلو یہ تھا۔

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کو ابھی ہندوستان ہی میں چھوڑا گیا۔ کیونکہ خاندان ولی اللہی کا صحیح جانشین پیدا نہ ہوا تھا۔

آپ کی عمر بھی ہنوز صرف چھبیس سال تھی۔ مگر زہد و تقوی کی جو بلند شان آپ کو عطا کی گئی تھی وہ اس واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ جو ارواحِ ثلاثہ سے بلفظہٖ نقل کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۱۱۴

ایک مرتبہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کے یہاں کئی وقت کا فاقہ ہوا اس کا تذکرہ اُن کی ماما نے کہیں کر دیا اس کی خبر کسی ذریعہ سے مفتی صدرالدین خاں صاحب کو بھی ہوگئی۔ مفتی صاحب نے تین سَو روپے شاہ صاحب کی خدمت میں بھجوا دیے۔ شاہ صاحب نے واپس کر دیے۔ اس پر مفتی صاحب وہ روپے لیکر خود حاضر ہوئے اور تخلیہ میں روپیہ پیش کئے

اور فرمایا۔ کہ شاید حضور کو خیال ہو کہ یہ صدر الصدور ہے۔ رشوت لیتا ہوگا۔ اس لئے میں عرض کرتا ہوں کہ میں رشوت نہیں لیتا۔ بلکہ یہ روپے میری تنخواہ کے ہیں۔ آپ ان کو قبول فرما لیجئے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ مجھے تو یہ وسوسہ بھی نہیں گذرا کہ تم رشوت لیتے ہو گے۔ میں تو تمہاری نوکری کو ہی اچھا نہیں سمجھتا۔ اس لئے میں ان کے لینے سے معذور ہوں۔

(ص ۱۱۴ ارواح ثلاثہ)

ص ۱۱۵ پر اسی حکایت میں یہ اضافہ بھی ہے۔ کہ حضرت شاہ صاحب کے ہاں اکثر فاقہ ہوتا تھا ایک مرتبہ آپ کے ہاں کئی روز کا فاقہ تھا خادمہ کسی بچے کو گود میں لئے ہوئے باہر نکلی۔ بچہ کے چہرے پر بھی فاقہ کے سبب پژمردگی تھی۔ اتفاق سے مفتی صدر الدین صاحب کہیں سے تشریف لا رہے تھے۔ بچہ کا چہرہ مرجھایا ہوا دیکھا۔ تو خادمہ سے پوچھا۔ بچہ کیسا ہے اس کا رنگ کیوں متغیر ہے۔ اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا کہ حضرت کے ہاں کئی وقت سے فاقہ ہے۔ مفتی صاحب کو سخت صدمہ ہوا۔

اس کے آخر میں یہ اضافہ بھی ہے کہ اس واقعہ کے بعد حضرت شاہ صاحب کو فکر ہوا کہ فاقہ کا راز کس طرح ظاہر ہوا۔ تحقیق سے معلوم ہوا۔ کہ خادمہ نے کہدیا تھا۔ آپ نے اس کو بلایا اور فرمایا نیک بخت اگر فاقہ کی برداشت نہیں ہے تو اور گھر دیکھ لو۔ مگر خدا کے لئے ہمارا راز افشا نہ کرو۔

ایک دوسرا واقعہ ارواح ثلاثہ اور تذکرۃ الرشید وغیرہ میں

منقول ہے۔ جس کو ہم یہاں تذکرۃ الرشید حصہ اول کے الفاظ کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ مفتی صدر الدین صاحب نے ایک کتاب شاہ صاحب کے ہاں سے منگوائی اور چونکہ اس کتاب کی جلد کہنگی کے باعث خراب ہو گئی تھی۔ اس لئے مفتی صاحب نے اس کی نئی جلد بندھوا کر شاہ صاحب کے پاس کتاب کو واپس کیا۔ اور لیجانے والے سے کہدیا کہ شاہ صاحب سے عرض کر دینا کہ موروثی دوکان کے کرایہ سے جلد بندی کی اجرت دی گئی ہے۔ تنخواہ میں سے نہیں دی گئی (مفتی صدر الدین صاحب سرکاری ملازم بعہدہ صدر الصدور مامور تھے اور اس کی تنخواہ فقہ سے ناجائز ہے تذکرۃ الرشید) اس وقت تو شاہ عبد الغنی صاحب نے کتاب رکھ لی مگر دوسرے دن جلد توڑ کر علیحدہ کر دی۔ تذکرۃ الرشید حصہ اول ص۲۴۳ نیز ارواح ثلاثہ ہیں یہ اضافہ ہے کہ کسی نے عرض کیا کہ حضرت اس جلد کا رکھنا تو جائز تھا۔ پھر کیوں توڑ دی۔ تو حضرت شاہ صاحب رح نے فرمایا "دل نہیں مانتا"

حضرت مولانا مفتی صدر الدین صاحب غالباً براہ راست انگریزی سرکار کے ملازم نہیں تھے بلکہ وہ دہلی کے بادشاہ کے ملازم تھے (اگرچہ بادشاہ کی شان صرف نواب جیسی رہ گئی تھی) مگر اس پر بھی احتیاط کا یہ عالم۔ اس موقعہ پر تذکرۃ الرشید حصہ اول کی ایک عبارت درج کرنی مناسب معلوم ہوتی ہے۔

مفتی صاحب فرمانے لگے۔ میاں رشید! (حضرت مولینا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی) تم ہی اچھے ہو۔ تارک دنیا ہو گئے۔ ہماری نوکری جائز نہیں تھی۔ اور ہم خوب سمجھتے تھے کہ جائز نہیں۔ مگر بزور علم اس کو جائز کہتے تھے (صـ۲ تذکرۃ الرشید ج ۱)

اور پھر صـ۳۴ کے الفاظ بھی ملاحظہ ہوں۔ جو درج ذیل ہیں:۔

ایک دن حضرت مولانا نے (مولانا رشید احمد صاحب نے) مفتی صدرالدین صاحب کا تذکرہ فرمایا کہ مرض الموت میں جب مفتی صاحب پر فالج گرا تو خوف الٰہی اس قدر غالب ہوا کہ برابر رویا کرتے اور جب کوئی شخص عیادت کے لئے پاس جاتا تو فرمایا کرتے تھے بھائی تمام عمر میری حرام خوری میں گذری۔ اگرچہ میں علم کے زور سے لوگوں کو منوا دیتا تھا۔ بھلا پھر نجات کی صورت کہاں!

یہ الفاظ فرماتے اور بے اختیار روتے تھے۔ اگر کوئی شخص تسکین اور تشفی کی غرض سے کوئی آیت بشارت سناتا۔ تو فرماتے ہاں میں بھی جانتا ہوں۔ مگر اس کے مقابلہ پر آیات وعید بھی تو ہیں۔

سیدنا شیخ الہندرحؒ کے فتوے بابت ترک موالات نصاریٰ پر اعتراض کرنے والے حضرات ان مقدس بزرگوں کے مسلک سے سبق حاصل کریں۔

تقریباً ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۵۲ء میں سیدنا حضرت مولانا رشید احمد

صاحب گنگوہی اور حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہما نے حضرت شاہ عبدالغنی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز سے بسلسلہ احادیث نبویہ ۔فیوض وکمالات کا اکتساب کیا ۔ اور خدمت اقدس میں حاضرہ کردہ تمام برکتیں حاصل کیں ۔ جو ایک مقدس استاذ سے بہترین طالب علم حاصل کرسکتا ہے ۔

اب جبکہ خاندان ولی اللہی کے صحیح جانشین پیدا ہوگئے تو شاہ صاحب رح نے ہجرت کا ارادہ فرمالیا ۔

چنانچہ بموجب روایت تذکرۃ الرشید" غدر کے قصہ میں حضرت شاہ صاحب نے ہجرت فرمائی ۔

کیوں ؟ کیا سبب تھا ۔ ظاہر ہے ۔ اگرچہ تفصیل معلوم نہیں واللہ اعلم

معرکہ بالاکوٹ سے قیام دارالعلوم دیوبند تک

سوال ہوتا ہے کہ کیا شہداء بالاکوٹ کی شہادت پر یہ تحریک ختم ہوگئی بیشک۔ انگریزی سیاست کی فراموش کن اور غلام ساز تاریخ نے ہمیں یہی بتایا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ چند مذہبی مجنونوں کا جنون تھا اور کسی مضبوط اسکیم کی بنیادوں پر اس کی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ تو آج تک گورنمنٹ برطانیہ علماء کے وقار کو ختم کرنے کے درپے کیوں ہے۔ کبھی علی گڑھ وغیرہ میں مردوں کی تربیت کر کے کبھی پنجاب میں نبیوں کی پرورش کر کے اور کبھی مسلمانوں کو عسکری تنظیم کی بھول بھلیاں میں الجھا کر یہ سبق کیوں پڑھایا جا رہا ہے کہ "مولوی کا مذہب غلط"

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی اور جہادی روح جو سید صاحب اور ان کے رفقاء نے ہندوستان میں دورہ کر کے پیدا کی تھی۔ وہ خود بھی فنا ہونے والی نہ تھی۔ علاوہ ازیں حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اور ان کی جماعت اُس کی پرورش کر رہی تھی۔

مزید براں حضرت سید صاحب نے بذات خود تبلیغی نظام کو باقی رکھا۔ چنانچہ مختلف حضرات کو مختلف خدمات کے لیے۔ سفر جہاد سے پیشتر ہی مامور فرمادیا گیا تھا۔

اور پھر دوسرے حضرات کو بھی وقتاً فوقتاً مامور فرما کر مرکز جہاد سے
ہندوستان بھیجتے رہے۔
ان حضرات کی خدمات کا سلسلہ۔ جہاد حریت ۱۸۵۷ء کی عمومی تحریک
سے جا ملتا ہے۔ اور اس بنا پر یقین ہو جاتا ہے کہ جہاد حریت ۱۸۵۷ء بھی اسی
تحریک کا ایک ثانوی نقش تھا۔
حضرت سید صاحب کی جانب سے جو حضرات مختلف خدمات کے
لئے مامور کئے گئے تھے ان کے حالات درج کرنے کی گنجائش اس مختصر
رسالہ میں نہیں مخصوص طور پر چند ممتاز حضرات کے اسمائے گرامی ذکر کئے
جاتے ہیں۔
ان حضرات کی جلیل القدر ہستیوں سے اہل ہند واقف ہیں۔ ان میں
ہر شخص انقلاب کا امام بن سکتا تھا۔ اور رہا۔ ان حضرات کی خدمات نے
بلاشبہ ہندوستان میں عظیم الشان انقلاب پیدا کیا۔ اور ان حضرات کی
خدمات تحریک سید صاحب کی قوت اور اس کے تقدس کی روشن دلیلیں ہیں
اس کے بعد بھی اگر کوئی کور باطن ان حضرات کی جلالت و عظمت کو
وہابیت و بریلویت کے قربان گاہ پر برباد کرنا چاہے تو اس کے سوا کیا کہا
جا سکتا ہے۔ کہ۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم — چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

حضرت سید صاحبؒ کے ممتاز خلفاء (۱) حضرت
مولانا عبدالحی صاحب (۲) حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب شہید

ان دونوں بزرگوں کے مختصر حالات پہلے گذرے۔

(۳) سیدنا میاں جی شاہ نور محمد صاحب جھنجانوی۔ آپ سلوک کے امام تھے۔ جہاد اور سلوک کی مشترک خدمات جن کی جلالت و عظمت کے اندازہ کے لئے یہی کافی ہے۔ کہ شیخ العرب و العجم سیدنا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی آپ کے خلیفہ ارشد تھے۔ جن سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دار العلوم دیوبند حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہما جیسے رشد و ہدایت کے آفتاب سرزمین ہند میں روشن ہوئے۔

(۴) پیر جی محمود شاہ صاحب نبیرہ حضرت شاہ عبد الرزاق صاحب جھنجانوی

(۵) حکیم غلام سبحانی صاحب جھنجانوی۔

(۶) حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش صاحب ساکن کاندھلہ ضلع مظفر نگر شاگرد رشید حضرت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز۔ آپ کا علم و فضل مشہور رہے۔ آپ نے مثنوی مولانا روم کا ساتواں دفتر مرتب فرمایا ہے۔

مفتی صاحب کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ "ساٹھ برس تک جو کچھ ہم نے پیا و دلیا تھا۔ سید صاحب کی بدولت وہ میدہ ہوگیا۔

مبلغ بنگال و اضلاع شرقیہ صوبہ یو۔پی (۷) حضرت مولانا کرامت علی صاحب جونپوری (۸) مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری

ان دونوں حضرات کو ہندوستان میں تبلیغ وارشاد کے لئے حضرت سید صاحب نے مامور فرمایا تھا۔ آپ کی جلیل القدر خدمات سے صوبہ بہار و بنگال اور اضلاع شرقیہ صوبہ یو۔پی کے مسلمان بخوبی واقف ہیں۔

جونپور کسی زمانہ میں علم و فضل کا مرکز رہا ہے۔ لیکن یہ زمانہ نحوست وادبار کا دور تھا کہ "بٹالہ" کی مشہور مسجد جو شاہان جونپور کی قدیم یادگار رہی ہے اور اپنی عجیب و غریب شاندار تعمیر کے لحاظ سے گویا ایک پہاڑ ہے جسے تراش دیا گیا ہے۔ وہ بھنگ اور چرس پینے والے اوباشوں کا اڈا تھی۔

حضرت مولانا کرامت علی صاحب حضرت سید صاحب کی طرف سے مامور ہو کر جونپور پہنچے۔ تو اپنے شہر کی اصلاح سب سے مقدم تصور کی۔ آپ نے اصلاح کا آغاز اسی مسجد سے کیا۔ اور وہیں نماز ادا کرنی شروع کی۔ نماز صبح کے بعد اشراق تک آپ خصوصیت سے اسی مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ ان شراب خور اوباش نے جب دیکھا کہ ان کا ٹھکانا چھن رہا ہے تو قتل کے درپے ہو گئے۔

ایک روز ان کا ایک سرغنہ اپنی ایک ٹولی لیکر قتل کے ارادہ سے راستہ میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ مگر خداوند عالم اپنے خاص بندوں کی حفاظت کیا کرتا ہے۔

بطفیل رسول پاک صاحب لولاک صلی اللہ علیہ وسلم خادمان دین کے لئے بھی قدرت کی جانب سے گویا یہی صدا آتی ہے۔ ان اللہ یعصمك من الناس۔

چنانچہ ابھی حضرت مولانا مسجد سے واپس تشریف لائے بھی نہ تھے کہ اس سرغنہ کے ہاتھ شل ہو گئے۔ اب تو ساری جماعت بہت پریشان تھی۔ مولانا مسجد سے واپس تشریف لائے تو یہ سب پیروں میں گر پڑے۔ مولانا واقعہ سے بے خبر تھے۔ ان کے گڑگڑانے اور معذرت کو دیکھ کر متعجب ہوئے جب واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ نے دعا فرمائی۔ خداوند عالم نے اس جماعت کو ظاہری اور باطنی صحت اور اصلاح سے مشرف فرمایا۔

اس قسم کی آپ کی بہت سی کرامتیں مشہور ہیں۔

جب آپ بقدر ضرورت جونپور اور اطراف کی اصلاح سے فارغ ہوئے تو آپ نے بنگال کا قصد فرمایا۔

بنگال کی بارانی موسم، ناہموار زمین جو ہر ایک قدم پر نالے اور ندیاں سارے صوبہ میں پھیلائے ہوئے ہے۔ آپ کے لیے ہزار ہا زحمتوں کا سبب ہی۔ مگر آپ کی بلند پایہ عزیمت کے سامنے یہ سب مشکلات ہیچ تھیں۔ سردیوں کے موسم میں بارش کے دوران میں ندیوں اور نالوں کو عبور کرتے ہوئے آپ دورہ فرماتے اور تبلیغ کا وہ فرض انجام دیتے جس کے لیے آپ مامور تھے۔

خلوص اور ایثار کا نتیجہ خوشگوار ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ کی تبلیغی جدوجہد کامیاب رہی اور ایک طویل و عریض علاقہ کی بہت بہتر اصلاح ہوگئی۔

حضرت مولانا عبدالاول صاحب جونپوری آپ کے صاحبزادے تھے۔ آپ نے والد بزرگوار کے نقش قدم پر چل کر تبلیغ و تدریس، ارشاد و

تصنیف کی قابل قدر خدمات انجام دیں

مدرسہ کرامتیہ ملا ٹولہ جونپور آپ کی یادگار ہے - آج کل مولانا عبدالسلام صاحب - مولانا حماد صاحب - مولانا عبدالمتین صاحب - مولانا محمد سلیم صاحب وغیرہ مولانا کرامت علی صاحب کے پوتے اپنی اپنی حیثیت کے بموجب خدمات انجام دے رہے ہیں -

مولانا محمد فصیح صاحب غازی پوری آپ کی خدمات، اور آپ کی جلالت شان بھی حضرت مولانا کرامت علی صاحب کی طرح مشہور ہیں - صوبہ بہار میں آجتک آپ کے مبارک تذکرے زباں زد ہیں - آپ آرہ شاہ آباد تشریف لے گئے تو موضع منگھی کے باشندگان نے آپ کی پالکی اپنے کندھوں پر اٹھائی - آپ آرہ شاہ آباد کی جامع مسجد میں (جو شاہ جہانگیر کی یادگار ہے اور " بیت خدا " اس کا سن تعمیر ہے) پہنچے تو وہاں بھی بھنگ گھٹتی تھی - تمباکو کوٹا جاتا تھا - آپ نے اصلاح فرمائی - مسجد کو مسجد بنایا - اس کے اوقاف کو برآمد کرایا - آج کل وہ کافی آمدنی رکھتی ہے - تقریباً ایک سو روپیہ ماہوار کا خرچ اُس کے وقف کی آمدنی سے چلتا ہے (جب کہ اس کی شرقی جانب میں ایک بہت بڑا قطعہ جس کے متعلق یقین تر کہ وہ مسجد کا ہی ہوگا دوسروں کے قبضہ میں ہے - جو وسط بازار میں واقع ہے - اور جس کی دوکانیں بہت زیادہ گراں بہا ہیں)

مبلغ مدراس. مولانا سید محمد علی صاحب رامپوری - آپ مولانا سید محمد علی صاحب رامپوری کے چھوٹے بھائی تھے -

مولانا حیدر علی صاحب معرکہ جہاد میں شہید ہو گئے تو آپ کو سید صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز نے تبلیغ کے لیے مامور فرما کر ہندوستان بھیجدیا۔ آپ رامپور روطن مالوف ہوتے ہوئے محرم ۱۲۴۵ھ میں مدراس پہنچے۔ مولانا عبدالرب صاحب خلف مولانا عبدالعلی صاحب کے مدرسہ میں آپ فروکش ہوئے۔

آپ کی مخلصانہ تبلیغی سرگرمیوں کا اثر یہاں تک وسیع ہوا کہ نواب محمد خان عالم تہور جنگ بہادر۔ اور نواب صاحب کے سارے اہل وعیال آپ سے بیعت ہو گئے۔

معرکہ بالاکوٹ کی خبریں سنکر۔ آپ ۱۲۵۱ھ میں رامپور واپس تشریف لائے اور کچھ عرصہ کے بعد آپ سفر حج کے لئے روانہ ہو کر کلکتہ پہنچے تھے کہ نواب صاحب موصوف کی بیگم صاحبہ نے اپنے خاص آدمیوں کے ذریعہ دوبارہ مدراس تشریف آوری کی درخواست کی۔ چنانچہ آپ ۲۶ رمضان المبارک ۱۲۵۱ھ کو دوبارہ مدراس تشریف لے گئے۔ آخر ۱۲۵۲ھ تک یعنی تقریباً ایک سال آپ نے مدراس میں قیام فرمایا۔ مگر پھر انگریزی پولیس نے آپ کے قیام کو خطرناک جانا اور ایک نوٹس کے ذریعہ سے مدراس سے خارج کر دیا۔ ۱۲۵۸ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

مبلغ حیدرآباد و بمبئی وغیرہ (۱) مولانا ولایت علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ عظیم آبادی (۲) مولانا عنایت علی صاحب و مولانا طالب علی صاحب یہ تینوں حضرات مولانا فتح علی صاحب کے صاحبزادے تھے۔ اور چھ واسطوں سے

ملا شکر اللہ صاحب استاد و مرشد۔ شاہزادہ مرزا محمد معظم خلف سلطان محی الدین عالمگیر کے پوتے تھے اور اسی اعزاز کی بنا پر آپ کا خاندان باثروت و معزز تھا۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آپ کا سلسلہ نسب حضرت مخدوم الملک احمد یحییٰ منیری رح تک پہنچتا ہے (ملاحظہ ہو در منثور)

مولانا فتح علی صاحب کے خسر یعنی مولانا ولایت علی صاحب وغیرہ کے نانا رفیع الدین حسین خاں بہت زیادہ صاحب عزت تھے۔ صوبہ بہار کے ناظم رہ چکے تھے مولانا ولایت علی صاحب ۱۲۰۵ھ میں پیدا ہوئے۔

آپ تحصیل علوم کے سلسلہ میں لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ مولانا محمد اشرف جو معقول و منقول کے بہتر ماہر مانے جاتے تھے، آپ کے اُستاد تھے۔ ان ہی دنوں میں حضرت سید صاحب لکھنؤ تشریف لے گئے۔ اور آپ کی تبلیغی اور مجاہدانہ سرگرمیوں کی شہرت ہوئی سلوک و طریقت کی شہرت نے حلقۂ مریدین میں روز افزوں اضافہ شروع کیا۔ مولانا محمد اشرف کا خیال تھا کہ سید صاحب کی وجاہت محض اس لئے ہے کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اور مولانا عبد الحی صاحب آپ سے بیعت ہیں۔ چنانچہ مولوی ولایت علی صاحب کے ذریعہ سے تخلیہ میں ملاقات کی اجازت سید صاحب سے طلب کی۔ مولوی ولایت علی صاحب اپنے استاد کی درخواست لیکر سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔ سید صاحب نے درخواست منظور فرمائی وقت مقررہ پر مولانا اشرف صاحب اور مولوی ولایت علی صاحب حاضر خدمت ہوئے۔ تخلیہ میں ملاقات ہوئی۔ سوالات و جوابات ہوں منطق

اور فلسفی موشگافیاں پیش کی گئیں۔ لیکن بالآخر مولانا اشرف علی صاحب کی عظمت کے سامنے یہ عقیدت ختم کرنا پڑا۔ یہ دونوں حضرات سید صاحب کی بیعت سے مشرف ہوئے۔ اور یہ پہلا انقلاب تھا جو مولانا اشرف صاحب کی منطقی اور فلسفی حیات میں رونما ہوا۔

اس کے بعد حضرت سید صاحب سفر حج کو تشریف لے گئے۔ جاتے ہوئے اور واپسی میں پٹنہ میں مولانا ولایت علی صاحب کے مکان پر قیام فرمایا۔ جہاں بہت زیادہ اعزاز و اکرام کیا گیا سفر حج کو تشریف لیجاتے ہوئے تو یہ موقعہ میسر نہ آسکا تھا۔ مگر واپسی پر مولانا ولایت علی صاحب کا سارا گھرانا حضرت سید صاحب سے بیعت ہو گیا۔

اور مولانا ولایت علی صاحب اور آپ کے دو چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی صاحب۔ مولانا طالب علی صاحب نیز مولانا باقر علی صاحب (مولانا ولایت علی صاحب کے چچازاد بھائی) حضرت سید صاحب کی ہمراہ ہوئے اور دنیا ناپائیدار کی ساری عیش و عشرت پر لات ماردی۔ اسی طرح اس خاندان کے دوسرے افراد مثلاً میر شمال علی خاں صاحب اور مولانا قمرالدین صاحب بھی بریلی میں حاضر ہو کر حضرت سید صاحب کے ساتھ منسلک ہو گئے۔

مولانا ولایت علی صاحب ایک متمول خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اس کے ساتھ طبعی طور پر نزاکت اور زیب و زینت کا بھی شوق تھا۔ طبعیت پر تکلف تھی۔ آپ کا لباس و پوشاک لکھنؤ کے بانکوں جیسا ہوتا تھا۔ کاکلیں آمن تاب پشت پر پڑی ہوتیں۔ اونچی چولی کا انگرکھا۔ مغرق زربفت

ریشمی یا زریں لباس یا ڈھاکے کی جامدانی زیب تن رہتی تھی۔ عطریات کا بھی بہت زیادہ شوق تھا۔ سونے کی انگوٹھیاں اور چھلے انگلیوں میں پڑے رہتے تھے۔

لیکن سید صاحب سے بیعت کرکے ساری زندگی میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ سارے تکلفات بالائے طاق رکھدے گئے۔ مولانا اسمٰعیل صاحب نے اپنا نائب مقرر فرمایا تھا۔ مگر شوق خدمت کا یہ عالم تھا کہ خود اپنے رفقا کی خدمت کیا کرتے تھے۔ جنگل سے لکڑیاں کا گٹھا اپنے سر پر رکھکر لاتے کھانا اپنے ہاتھوں سے پکاتے۔ مٹی گارے کا کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔

جب آپ بریلی میں حضرت سید صاحب کی خدمت میں حاضر اور مذکورۂ بالا خدمات میں مشغول و مصروف تھے آپکے والد صاحب نے ایک قدیمی خدمتگار کو چار سو روپئے نقد اور دس پندرہ جوڑے عمدہ کپڑوں کے اور جوتے وغیرہ دیکر بریلی بھیجا۔ بریلی پہنچکر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ دریا کے کنارے پر کام کررہے ہیں۔ یہ خادم وہاں حاضر ہوا۔ مولانا ولایت علی صاحب دوسرے رفقا کے ساتھ گارے مٹی کا کام کررہے تھے۔ اور کچھ ایسی اجنبی ہئیت اور صورت ہوگئی تھی کہ خادم نے بتانے اور خود مولانا ولایت علی صاحب کے بار بار اقرار کے باوجود یقین نہ کیا۔ کہ مولانا ولایت علی صاحب یہی ہیں۔ وہ پھر حضرت سید صاحب کے قافلہ میں واپس آیا۔ جب سب نے اُس کو یقین دلایا کہ مولانا ولایت علی صاحب یہی ہیں۔ تب اس نے وہ رقم اور کپڑے پیش کئے اور اس عجیب و غریب حالت سے متاثر ہوکر خوب رویا۔ مولانا ولایت علی صاحب نے وہ تمام جوڑے اور نقد روپیہ سید صاحب کی خدمت

میں پیش کر دیا۔ اور خود وہی موٹی لنگی اور معمولی کرتا پہنے رہے جو پہلے سے پہنے ہوئے تھے۔

اس کیفیت سے مطلع ہو جانے پر مولانا فتح علی صاحب یعنی آپکے والد ماجد مع مولانا فرحت حسین صاحب بریلی آئے۔ اور عزیز فرزند کی چشم بوسی سے مسرور ہوئے اور کچھ عرصہ قیام کے بعد واپس پٹنہ تشریف لے گئے۔ مولانا ولایت علی صاحبؒ اور آپکے مذکورہ بالا پانچوں بھائی حضرت سید صاحبؒ کی ہمراہ یاغستان تشریف لیگئے۔ مولانا ولایت علی صاحبؒ نے وہاں بھی عالی شان خدمات انجام دیں۔ زمان شاہ والی کابل اور دوست محمد خاں وزیر کابل کے پاس سفیر بنا کر آپ ہی کو بھیجا گیا تھا۔

کابل سے واپسی پر آپ کو ہندوستان کی واپسی کا حکم ملا۔ یہ مفارقت آپ کو گوارا نہ تھی۔ مگر سید صاحبؒ نے فرمایا "مولانا ہم آپکو تخم کرکے اٹھاتے ہیں"

بہر حال آپ واپس پٹنہ تشریف لائے۔ اور پھر حیدر آباد تشریف لے گئے۔ نواب مبارز الدولہ کا زمانہ تھا۔ نواب صاحبؒ نے بنفس نفیس آپکا بہت اعزاز کیا۔ اور آپ کا حلقہ بگوش ہو کر غیر شرعی کثرت ازدواج اور دیگر عیش و عشرت کے لوازمات سے توبہ کی۔

مولوی زین العابدین صاحب اور مولوی محمد عباس صاحب جو دربار میں خاص عزت رکھتے تھے۔ مولانا موصوف سے بیعت ہوئے۔ اور پھر نمایاں خدمات انجام دیں۔ آپ نے وہاں ایک نکاح بھی کیا۔

تقریباً ۱۲۴۷ھ میں آپ بمبئی اور سورت تشریف لے گئے اور پھر جب معرکہ بالاکوٹ کی شکست کا علم ہو چکا۔ نیز اُن ہی ایام میں آپکے والد بزرگوار کا بھی انتقال ہو گیا۔ تو آپ پٹنہ واپس تشریف لے آئے۔

آپ نے تبلیغ و جہاد کا ایک نیا نظم قائم کیا۔ چھوٹے بھائی مولینا عنایت علی صاحب کو بنگال بھیجا۔ مولانا زین العابدین صاحب اور مولانا محمد عباس صاحب حیدر آباد میں کام کر رہے تھے۔ دوسرے احباب و رفقاء کو دوسرے مقامات پر بھیجا اور دو سالہ قیام پٹنہ کے بعد حج بیت اللہ شریف کے لئے تشریف لے گئے۔

زیارت بیت اللہ سے فراغت کے بعد یمن۔ نجد۔ اسیر۔ مسقط۔ حضرموت۔ مخا۔ حدیدہ وغیرہ کا دورہ کرتے ہوئے تقریباً دو سال بعد واپس کلکتہ پہنچے۔ اور پھر بنگال کا دورہ کرتے ہوئے اپنے بھائی مولانا عنایت علی صاحب کو ہمراہ لے کر پٹنہ واپس تشریف لائے۔

سکھوں پر دوبارہ حملہ مولانا ولایت علی صاحب نے اس تمام سیاحت اور سفر سے واپس آکر دوبارہ جہاد کا سلسلہ قائم کیا۔ مولانا عنایت علی صاحب کو بنگال کے بجائے سکھوں کے مقابلہ پر بھیجا۔ اس عرصہ میں گورنمنٹ برطانیہ کی نظریں سکھوں سے پھر گئی تھیں۔ اور اس نے سکھ حکومت کے ختم کرنے کے لئے عملی اقدام شروع کر دیا تھا۔ سکھوں کے دربار نے بھی قسم قسم کی بدشگونیوں کا اظہار شروع کر دیا تھا۔

۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ مرا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا کھڑک سنگھ تخت نشین ہوا۔ ابھی صرف ۶ ماہ گذرے تھے کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ کھڑک سنگھ کا بیٹا نونہال سنگھ باپ کی ارتھی جلا کر واپس ہو رہا تھا۔ جب شہر پناہ کے قریب پہنچا تو اس کی تاجپوشی کی مسرت میں توپیں سر ہونے لگیں۔

کہا جاتا ہے کہ نونہال سنگھ کے ایما کے موجب بیک وقت ڈیڑھ سو ۱۵۰

سرکر دی گئیں جو شہر پناہ کے اسی دروازہ کے قریب رکھی گئی تھیں جہاں سے نونہال سنگھ کی سواری اب گذر رہی تھی۔ مخلوقات کے ہجوم نے جلوس کی رفتار نہایت سست کر رکھی تھی توپوں کی آواز کے صدمہ سے پھاٹک کا ایک سائبان گر گیا۔ جو نونہال سنگھ کے اوپر آگر پڑا۔

نونہال سنگھ دب کر وہیں ختم ہو گیا۔

اس حادثہ کے بعد رنجیت سنگھ کے دوسرے بیٹے شیر سنگھ کو راجہ بنا دیا گیا۔ لیکن شیر سنگھ اور سکھ حکومت کے پرانے وزیر" دھیان سنگھ" میں کچھ مخالفت ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیر سنگھ کو جبکہ وہ فوج کا معائنہ کر رہا تھا۔ تمنچہ کی گولی سے ہلاک کر دیا گیا۔

اس حادثہ کے بعد شہر میں   ہوا ہو گیا۔ آخر کار فوج خالصہ نے حالات پر قابو پا لیا۔

دلیپ سنگھ نابالغ کو تخت پر بٹھایا گیا۔ اور اس کی ماں کو مختار کر دیا گیا۔ ابھی زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ ماہ دسمبر ۱۸۴۵ء میں انگریزوں سے جنگ شروع ہو گئی جو فروری ۱۸۴۶ء تک جاری رہی۔ جس کا نتیجہ خالصہ فوج کی شکست اور ابتری تھی دھیان سنگھ وزیر کا چھوٹا بھائی گلاب سنگھ تھا یہ اس جنگ کے مخالف رہا۔

جب خالصہ فوج کو ہزیمت ہوئی تو گلاب سنگھ کے ذریعہ سے صلح کی گئی۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد دربار خالصہ سے گلاب سنگھ معتوب ہوا۔ تو سرکار انگریزی نے حسن خدمات کے صلہ میں کشمیر اور جموں کا علاقہ سکھ حکومت

سے علیحدہ کر کے گلاب سنگھ کے حوالہ کر دیا ۱؎

سکھوں کی اس مختصر تاریخ سے آپ کو گلاب سنگھ کا "شان نزول" بھی معلوم ہو گیا ہوگا۔ کیونکہ آئندہ واقعات میں اسی کا تذکرہ آئے گا اور مولانا عنایت علی صاحب رح کی جنگ اسی سے ہوئی۔

نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شیر سنگھ کا قتل اور پھر عام بلوہ یا صرف دھیان سنگھ برادر گلاب سنگھ کی سازش تھی یا کسی اور طاقت کا بھی اس میں ہاتھ تھا۔

یہ تھی انگریز کی دوسری ڈپلومیسی کہ رنجیت سنگھ اور سکھ حکومت کو سید صاحب سے چھڑا کر خود شکار کر لیا ع

چو دیدم عاقبت خود گرگ بودی

بہر حال مولانا عنایت علی صاحب بالاکوٹ پہنچے۔ جو گلاب سنگھ کے قلمرو میں داخل تھا۔ اور جہاد شروع کر دیا۔

نواب مبارز الدولہ کی معزولی اور گرفتاری پہلے گذرا کہ نواب مبارز الدولہ۔ مولانا ولایت علی صاحب کے سلسلہ میں منسلک ہو گئے تھے اور مولانا زین العابدین صاحب اور مولانا محمد عباس صاحب حیدرآبادی جو نواب صاحب موصوف کے خاص معتمد۔ اور مولانا ولایت علی کے حلقہ بگوش تھے۔ حیدر آباد میں خدمات کے لئے مامور کئے گئے تھے۔

۱؎ ملاحظہ ہو تاریخ پنجاب از صہ تا صہ ۱۲

کہا یہ جاتا ہے کہ نواب مبارز الدولہ اور اُن کے بھائی نواب ناصرالدلہ کے باہمی کچھ مخالفت ہوئی۔ حتے کہ سرکار انگریزی تک نوبت پہنچی۔ مشفق سرکار انگریزی نے نواب مبارز الدولہ کو معزول کر کے گرفتار کرادیا۔ اب آپ کی پوری جماعت خطرہ میں تھی۔ چنانچہ مولانا زین العابدین صاحب مولانا عباس علی صاحب اور اس جماعت کے دیگر علمار کو حیدر آباد سے نکلنا پڑا۔ یہ سب حضرات حیدرآباد سے فرار ہوکر مولانا ولایت علی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

مولانا ولایت علی صاحب نے حیدر آبادی علمار کو بنگال۔ اڑیسہ اور اطراف الہ آباد کی تبلیغی خدمات کے لئے مامور فرما دیا۔

بہر حال پورے ہندوستان میں پھر حضرت سید صاحب کے زمانہ کی طرح تبلیغ و اصلاح اور ترغیب جہاد کا سلسلہ قائم ہوگیا۔

لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ پنجاب میں برائے نام سکھوں کی حکومت باقی رہ گئی تھی۔ انگریزی ریزیڈنٹ مقرر ہوچکا تھا۔ اور ۱۲ ہزار انگریزی فوج لاہور میں مقیم تھی۔ اور سکھوں کے سابق وزیر گلاب سنگھ دونوں حکومتوں کی خیر خواہی یا گورنمنٹ برطانیہ کی وفاداری اور اپنی مربی یعنی سکھ حکومت سے غداری کے صلہ میں کوہستانی علاقہ نیز کشمیر اور جموں کا مستقل راجہ قرار دیدیا گیا تھا۔ جو انگریزوں کا حلیف اور اُنکی پناہ میں تھا۔ لہذا اب گورنمنٹ کی مرضی یہ نہ رہی تھی کہ اس علاقہ میں کوئی شورش ہو بہر حال مولانا ولایت علی صاحب اپنے کام میں قوت سے مشغول تھے

اور پھر اپنے چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین صاحب کو اپنا قائمقام کر کے خود اپنے خاص رفقاء مثلاً مولانا فیاض علی صاحب مولانا یحییٰ علی صاحب۔ مولانا اکبر علی صاحب وغیرہ کو ہمراہ لیکر بالاکوٹ تشریف لے گئے یہاں مولانا عنایت علی صاحب تین سال سے گلاب سنگھ کے مقابلہ پر جہاد کر رہے تھے۔

مولانا ولایت علی صاحب وہاں پہنچے تو آپ ہی کو امیر بنا دیا گیا۔ اور ڈیڑھ سال تک متواتر سلسلہ جہاد جاری رہا۔ گلاب سنگھ کو ناک چنے چبا دئے۔ اور کافی علاقہ فتح کر لیا۔

انگریزی گورنمنٹ کی مداخلت مصنف سوانح احمدی تحریر فرماتے ہیں :- سرکار انگریزی نے ایک خط مولانا ولایت علی صاحب اور مولانا عنایت علی صاحب کے نام لکھا کہ گلاب سنگھ نے سرکار انگریزی سے معاہدہ کیا ہے۔ لہٰذا وہ گورنمنٹ انگریزی کی حمایت میں ہے۔ پس اُن سے جنگ کرنا انگریزی سرکار سے جنگ کرنا ہے۔ اور اس تحریر کے تھوڑے دنوں بعد "انگیو صاحب" اور "لمہرن صاحب" کے زیر کمان گلاب سنگھ کی امداد کے لئے ایک فوج روانہ کی گئی۔

انگریزی افسروں نے جو کام سب سے پہلے کیا وہ یہ تھا کہ تندگان ملک کو طمع دے کر مجاہدین سے برگشتہ کر دیا۔ اور ایک خاص تاریخ مقرر کر کے وہی کرادیا جو اس سے پیشتر حضرت سید صاحب کے مجاہدین کے ساتھ کیا گیا تھا۔

یعنی ایک ہی دن میں تمام مفتوحہ علاقہ میں بغاوت کرا کر مقامی کارکن اور مجاہدین کو شہید کر دیا گیا۔ سید ضامن شاہ رئیس بالاکوٹ مجاہدین کے قدیمی معاون تھے۔ مگر اس موقعہ پر وہ بھی پھسل گئے۔ اور مجاہدین کے مقابلہ پر علم بغاوت بلند کر دیا۔

علما مجاہدین کی گرفتاری

اب ان حضرات نے اس علاقہ کو چھوڑ کر "سوات" کا قصد کیا۔ مگر راستہ میں انگریزی عملداری تھی۔ چونکہ اب تک انگریزوں سے کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی۔ نیز ان کے نوٹس کے بعد جنگ کا موقعہ بھی میسر نہ آیا تھا۔ تو ان حضرات نے صلح پسندی کا اظہار کرتے ہوئے سوات جانے کے لئے راستہ کی درخواست کی فوجی افسروں نے اجازت دے دی۔

چنانچہ یہ حضرات مجاہدین کے لشکر (اور روہیلہ نوجوانوں کو جو ان کے نوکر تھے) ہمراہ لے کر روانہ ہوئے مگر جب یہ ساری قوم انگریزی حدود میں داخل ہوچکی تو انگریزی فوجوں نے ایک دم ان کا محاصرہ کر لیا۔ سابق افسران فوج جنہوں نے پروانہ راہ داری دیا تھا۔ وہ تبدیل ہوگئے تھے اور موجودہ کمانڈر نے جواب دیدیا کہ اُن کو ایسی پناہ دینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ انہوں نے جو کچھ کیا اپنی رائے سے ۔ بلا منظوری سرکار انگریزی کیا تھا۔

(یہ تھا اُن تہذیب کے دھوکہ بازوں کا عمل جو خدمت خلق کا بیڑا اٹھا کر ہندوستان آئے تھے)

مجاہدین اور روہیلہ نوجوان اُس وقت بھی لڑنے کو تیار تھے۔ مگر مولانا ولایت علی صاحب وغیرہ نے مقابلہ کی طاقت نہ محسوس کرتے ہوئے ہتھیار ڈالدئے۔ چنانچہ یہ حضرات گرفتار کرلئے گئے۔ اور مجاہدین کی ساری جمعیت اور جملہ جنگی سامان انگریزی فوج کی زیر حراست لاہور کو روانہ کردیا گیا۔

حضرات علماء پر نگرانی سخت تھی۔ لیکن مجاہدین کی جماعت میں سے تقریباً سو حضرات خفیہ فرار ہو کر سوات پہنچ گئے۔

لاہور میں ان حضرات کے ساتھ ظاہرداری کا برتاؤ بہت کچھ کیا گیا جو انگریز کی عیاری اور چالاکی کا معمولی کرشمہ ہے۔ اور جملہ جنگی سامان ضبط کرلیا گیا۔ اور ان حضرات کو بقیہ مجاہدین کے ساتھ پٹنہ پہنچا دیا گیا۔

پٹنہ میں حضرت مولانا ولایت علی صاحب کو مجبور کیا گیا کہ وہ دو سال کے لئے مچلکے داخل کریں۔ ان حضرات کے پاس اس وقت منظوری کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

بہرحال دو سال تک ان حضرات کو مچلکہ کا پابند رہنا پڑا۔ اگرچہ ہر ایک لمحہ شاق تھا۔ اور ہر وقت یہی دعا تھی اللھم اخرجنی من ہذہ القریۃ الظالم اھلھا۔

اس عرصہ میں مولانا عنایت علی صاحب پھر بنگال تشریف لے گئے اور اور تبلیغی خدمات شروع کردیں

مولانا ولایت علی صاحب نے پٹنہ میں درس تدریس۔ وعظ و تبلیغ اور

اصلاح رسوم کی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ نکاح بیوگان جو اب تک اُس نواح میں بہت معیوب ہے، اُس کے برخلاف جہاد شروع کیا۔ اور اوّلاً تو خود ایک بیوہ سے نکاح کیا تھا۔ جن کے شوہر حضرت سید صاحب کے ساتھ شہید ہو گئے تھے۔ اور اس مرتبہ جب مولانا اکبر علی صاحب کا انتقال ہو گیا تو اُن کی بیوہ کا نکاح مولانا عنایت علی صاحب سے کر دیا۔

اس نکاح کے سلسلہ میں ایک دوسری سنت پر بھی عمل ہوا۔ یعنی مولانا عنایت علی صاحب بنگال میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ اُن کی غیبوبت میں مولانا ولایت علی صاحب نے اصحمہ شاہ نجاشی کی طرح ان خاتون کا نکاح کر کے اُن کو بنگال روانہ کر دیا۔

جب میعاد مچلکہ ختم ہونے میں چند ماہ باقی رہ گئے۔ تو مولانا ولایت علی صاحب نے اپنے مکانات کو خوب سجایا۔ عمدہ عمدہ گھوڑے خرید کر اصطبل میں بندھوائے اور اسی طرح کبوتر خانہ وغیرہ تمام مکانات اور سامان کو خوب آراستہ کیا۔ دیکھنے والوں کو بھی یقین ہوا کہ مولانا اب دنیاوی ساز و سامان میں مشغول ہو گئے۔ جہاد وغیرہ کے تمام خیالات ختم ہو گئے۔

لیکن جب مچلکہ کی مدت ختم ہو گئی تو نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے مخلص احباب کی جمعیت ہمراہ لے کر پٹنہ سے روانہ ہو گئے۔ راستہ میں موضع گو ڈانا۔ کوئیلور۔ آرہ شاہ آباد۔ غازی پور وغیرہ وغیرہ ہوتے ہوئے ڈیڑھ سال کا عرصہ صرف اسی دورہ پر ختم کرنے کے بعد آپ دہلی پہنچے۔ آپ کے ہمراہ جاں نثاروں کا مجمع بڑھتا رہا۔ جو تین سو چار سو کا ایک فوجی دستہ ہو گیا۔

دہلی آپ نے ایک ماہ قیام کیا۔ اور جامع مسجد یا فتحپوری وغیرہ میں آپ کے وعظ کا سلسلہ متواتر رہا۔ مولانا امام علی صاحب ایک بزرگ بیگم زینت محل کے استاد تھے۔ وہ آپ کے مرید ہو گئے۔

بیگم زینت محل اور بادشاہ نے آپ کی دعوت کی درخواست کی۔ جو غیر معمولی اصرار و انکار کے بعد منظور کی گئی۔ اور اس تقریب سے آپ قلعہ میں تقریباً پچھتر آدمیوں کو لے کر گئے۔

بادشاہ نے آپ کا بہت زیادہ اعزاز و اکرام کیا۔ دعوت کے روز تمام عمال و حکام اور ریزیڈنٹ وغیرہ حاضر تھے۔

یہ بادشاہ اگرچہ اپنے اختیارات کے لحاظ سے بساط شطرنج کا مہرہ تھا۔ مگر دل سے یقیناً بادشاہ تھا۔ سب سے پہلا سوال یہی تھا کہ وجہ گذران کیا ہے۔ مولانا ولایت علی صاحب نے فرمایا کہ آپ ہی کے بزرگوں کا عطیہ۔ اس پر بادشاہ آب دیدہ ہوئے۔ پھر مولانا نے وعظ فرمایا۔ اولاً ترغیب اور بشارت کی چیزیں بتائیں۔ پھر عمل نہ کرنے والوں کے متعلق خداوندی عذاب کا تذکرہ شروع کیا۔ جس پر وزیر نے آپ کو بتایا کہ بادشاہ کے سامنے عذاب کی چیزیں بیان کرنے کا دستور نہیں محض بشارت کی آیات بیان کی جاتی ہیں۔ مگر مولانا نے اسپر کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ بہرحال وعظ بہت زیادہ شاندار اور موثر تھا۔ جس سے فراغت پر آپ کو اراکین دولت نے ریزیڈنٹ کی ہمراہی میں قلعہ کی سیر کرائی۔ ریزیڈنٹ صاحب بادشاہ کی اس تمام تعظیم و تکریم کو شبہ کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔

اس موقعہ پر یہ لطیفہ قابل عبرت ہے کہ اس زمانہ میں دہلی میں اُلّو کے حلال یا حرام ہونے کی بحث خوب زور پکڑے ہوئی تھی۔ مولانا صاحب کے سامنے بھی ایک جماعت یہ سوال لے کر آئی۔ آپ کا جواب دانشمندانہ اور ظریفانہ تھا۔ کہ "بھائیو میں الووں کے جھگڑے میں نہیں پڑا کرتا۔ مجھے معاف رکھو۔

شعبان کا مہینہ ختم ہو رہا تھا بادشاہ نے درخواست کی کہ رمضان شریف میں آپ یہیں قیام فرمائیں۔ قلعہ میں قرآن شریف سنائیں ہم سب تراویح میں شریک ہوا کریں گے۔ لیکن ریزیڈنٹ کی تشویشناک تجسس کو دیکھتے ہوئے مولانا نے شاہی فرمائش کے قبول کرنے سے معذرت کر دی۔ اور اسی وقت دہلی سے کوچ کر کے شام کو جمنا پار آکر رمضان شریف کا چاند دیکھا۔ پھر یہاں سے روانہ ہو کر منزل بمنزل قیام کرتے ہوئے لدھیانہ پہنچے وہاں چند روز قیام کیا۔ اسی دوران میں مولانا عنایت علی صاحب بھی آپ کے پاس پہنچ گئے۔ اس کے بعد مختلف شہروں کا دورہ کرتے ہوئے اور مناسب قیام فرماتے ہوئے علاقہ یاغستان کے ستھانا مقام پر پہنچ گئے۔ جو مجاہدین کا مرکز تھا۔ سید اکبر شاہ صاحب اور مجاہدین کے لشکر نے آپ کا پرتپاک استقبال کیا۔

ہندوستان کے دوسرے مشتاقان جہاد بھی خبر پا کر ستھانا پہنچتے رہتے اور لشکر میں شریک ہوتے رہے کچھ دنوں مجاہدین کی تعلیم و تلقین ہی مشغلہ رہا۔ مگر پھر مولانا عنایت علی صاحب کی زیر سرکردگی جہاندار خان

والی انب سے چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی۔ اور مقام منگل تھانہ قیام کیا۔ لیکن اسی اثنا میں مولانا ولایت علی صاحب مرض خناق میں مبتلا ہو کر ماہ محرم ۱۲۶۹ھ راہی ملک عدم ہوئے۔ قدس سرہ العزیز۔

مولانا عنایت علی صاحب بڑے بھائی کی جگہ امیر مقرر ہوئے۔ ہندوستان کا جہاد حریت اسی زمانہ میں ہوا۔ مگر ۱۲۷۳ھ ہجری مطابق ۱۸۵۸ء میں آپ کا بھی انتقال ہوگیا۔ پھر اس جماعت کے دوسرے بزرگ امیر ہوتے رہے اور انتقال کرتے رہے۔

اس تحریک کی قوت۔ ہمہ گیری اور قائدین تحریک کے ایثار۔ خلوص جفا کشی اور بلند ہمتی کے متعلق انگریزوں کی کافی شہادتیں موجود ہیں۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ العالی شیخ التفسیر ندوۃ العلماء لکھنؤ نے ان کو نہایت مناسب طرح سے ترتیب دیا ہے۔ ہم مولانا کے شکریہ کے ساتھ اس تحریر و ترتیب کو بجنسہ نقل کئے دیتے ہیں۔ اور پھر حضرت مولانا ولایت علی صاحب کے جہادی کارنامے مولانا یحییٰ علی صاحب کی مختصر سوانح اور خدمات بھی مولانا موصوف اور در منثور کے حوالہ سے درج کئے جائینگے۔ (ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہید رح صفحہ ۳۴۲ تا صفحہ ۳۵۶)

آپ کے بعد اور آپ کی زندگی میں آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے جانشین داعزہ مولانا فرحت حسین صاحب رح مولینا احمد اللہ صاحب رح اور مولانا یحییٰ علی صاحب نے پورے انہماک اور قابلیت سے یہ خدمات انجام دیں اور ایک منظم سلطنت کی طرح اس نظام کو چلایا۔ یہ نظام اپنی وسعت و استحکام

مبلغین کی سیرت و اخلاق اور جوش ایثار میں ایک بےنظیر نظام تھا جس کی مثال مسلمانوں کے داخلہ ہند سے لیکر اس وقت تک ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے ہوگا۔

اس جماعت و تحریک کا سب سے بڑا دشمن ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر اپنی کتاب "مسلمانان ہند" میں لکھتا ہے:۔

یہ لوگ مشنریوں کی طرح انتھک کام کرتے تھے وہ بےلوث اور بےنفس لوگ تھے۔ جن کا طریق زندگی ہر شبہ سے بالاتر تھا اور روپیہ اور آدمی پہنچانے کی انتہائی قابلیت رکھتے تھے۔ ان کا کام محض تزکیہ نفس اور اصلاح مذہب تھا۔"

میرے لیے ناممکن ہے کہ میں عزت و عظمت کے بغیر ان کا ذکر کروں۔ ان میں سے اکثر نہایت مقدس اور مستعد نوجوانوں کی طرح زندگی شروع کرتے تھے اور ان میں سے بہت سے اخیر تک مذہب کے لیے اپنی جانفشانی اور جوش قائم رکھتے تھے۔" جہاں تک مجھے تجربہ ہے یہ یقینی ہے کہ وہابی مبلغین سب سے بڑے روحانی اور کم سے کم خودغرض نوع کے لوگ ہیں۔"

مولانا یحییٰ علی صاحب عظیم آبادی کے متعلق لکھتا ہے:۔

"امیر جماعت یحییٰ علی کے مختلف فرائض تھے وہ ہندوستان میں فرقہ کے روحانی رہنما کی حیثیت سے تمام جماعتی مبلغین سے خط و کتابت رکھتے تھے اور انہوں نے ایک اصطلاحی زبان

میں چند مبہم عبارتیں ترتیب دی تھیں، جن کو وہ خود استعمال کرتے
تھے اور جن کے ذریعہ سے وہ طمینان سے بڑی بڑی رقمیں
سلطنت کے مرکز سے سرحد پار باغیوں کے کیمپ دھانہ بھیجتے
تھے۔ وہ مسجدوں میں وعظ و تقریر کرتے اور مذہبی دیوانوں کی
فوج کو بندوقیں جانچکر بھیجتے۔ طلبا، کو روحانی اور دینی درس
و تعلیم دیتے اور انہوں نے اپنے ذاتی مطالعہ سے عربی کے علماً
و مصنفین سے اعلیٰ واقفیت پیدا کرلی تھی۔

لیکن اس سازش کا سب سے زیادہ نازک کام پٹنہ یا بالفاظ خود
"چھوٹی خانقاہ" سے سرحد پار باغیوں کے مرکز "بڑی خانقاہ"
کو رنگروٹ بھیجنا تھا۔ بنگالی متبعین کو راستہ میں صدہا بے
تکے اور پریشان کن سوالات کا جواب دینا پڑتا تھا۔ اس کو
پنجاب اور شمال مغربی ہندوستان کے وسیع صوبوں میں سے
ہو کر تقریباً دو ہزار میل کا سفر طے کرنا ہوتا تھا۔ جہاں ہر گاؤں
میں اسکی جسمانی شکل اور زبان اس کو اجنبی ثابت کرتی تھی۔

اس خطرناک کام میں یحییٰ علی ہی کی ذہانت اور انتظامی قابلیت
کام کر رہی تھی۔ انہوں نے تمام راستہ پر اپنے وہابی پیرو متعین
کر دئے تھے۔ جو جماعت کے معتبر اشخاص کے ماتحت تھے۔ یحییٰ علی
کی مردم شناسی اور حسن انتخاب قابل داد ہے کہ ان کے انتخاب
کیے ہوئے آدمیوں میں سے ایک شخص کو بھی پکڑے جانے کا خوف

وخطرہ شناخت ہوجانا، انعام کا لالچ اپنے رہنماؤں اور پیشواؤں
کے خلاف آمادہ نہ کرسکا"

اس تنظیم کی وسعت اور جماعت کی سیرت کے متعلق بنگال کے کمشنر پولیس کی
یہ شہادت پڑھنی چاہیئے۔

"اس جماعت کے ایک ایک مبلغ کے پیرو اسی اسی ہزار ہیں،
جن میں آپس میں مکمل مساوات ہے۔ جنہیں ہر ایک دوسرے کے
کام کو اپنا ذاتی کام سمجھتا ہے اور مصیبت کے وقت کسی بھائی کی
مدد میں اس کو کسی بات سے عذر نہیں ہوتا۔[۱]

"مشرقی بنگال میں ہر ضلع بغاوت کے رنگ میں رنگ گیا تھا۔ اور
پٹنہ سے سمندر تک گنگا کے تمام راستہ میں مسلمان کسان باغیوں
کے مرکز کے لئے ہفتہ وار امداد دیتے تھے"

اس تحریک و تبلیغ سے عام مسلمانوں میں جہاد کا جو جذبہ اور ولولہ پیدا ہوگیا تھا
اس کی مثال کم سے کم ہندوستان میں اس سے پہلے اور اس کے بعد نہیں ملتی۔
ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے :۔

"صوبہ متحدہ کے ایک انگریز کارخانہ دار نیل کا بیان ہے اس کے
دیندار ملازم اپنی تنخواہ یا مزدوری کا ایک جز ستھانہ کیمپ کے لئے
علیحدہ کرکے رکھ لیتے تھے۔ جو لوگ زیادہ جری تھے وہ تھوڑے
بہت زمانہ کے لئے ستھانہ جاکر خدمت کرتے تھے۔ جس طرح ہندو

---

[۱] مسلمانان ہند۔ ڈاکٹر ہنٹر، خطوط ۱۰۰ امورخہ ۱۳ مئی ۱۸۴۳ء دیمبر ۵ ۱۸۴۷ء ۱۲۶

ملازم اپنے بزرگوں (ہرکھوں) کے شرادھ کے لئے چھٹی مانگتے تھے۔ اسی طرح مسلمان ملازم یہ کہہ کر چند ماہ کی رخصت لیتے تھے کہ انھیں فریضہ جہاد کے ادا کرنے کے لئے مجاہدین کے ساتھ شریک ہونا ہے۔"

"کوئی وہابی باپ اپنے کسی غیر معمولی دیندار بیٹے کے متعلق نہیں کہہ سکتا تھا، کہ وہ کس وقت (جہاد کے لئے) اس کے گھر سے غائب ہو جائے۔"

مسٹر جیمس او کینیلی لکھتا ہے:-

کمزور اور بزدل بنگالی مسلمان، خودداری اور جوش جہاد میں افغانوں سے کم نہ تھے۔

جماعت کے نظام کا حال مندرجہ ذیل اقتباس سے، معلوم ہوگا۔ ڈاکٹر ہنٹر اس کے ایک رکن کے متعلق لکھتا ہے۔

اس کا تحصیل عشر، زکوۃ کا طریقہ بہت سادہ اور مکمل تھا۔ اس نے مالگزاری کی حیثیت سے، متعدد گاؤں، مجموعوں میں تقسیم کردئے تھے، ہر مجموعہ پر ایک خاص محصل مقرر تھا۔ یہ افسر اپنی جگہ پر ہر دیہات کے لئے ایک تحصیلدار مقرر کرتا تھا۔ آئی ہوئی رقموں کو وہ جانچتا اور ضلع کے مرکز کو بھیجدیتا۔ قانوناً ہر دیہات میں ایک محصل مقرر تھا۔ لیکن جن دیہاتوں میں آبادی زیادہ ہوتی وہاں اس کام کے لئے ایک عملہ رکھنا پڑتا تھا۔ جن میں کچھ دین کے

سردار ہوتے تھے جو نماز پڑھاتے تھے۔ اور چندہ وصول کرتے
تھے۔ کچھ عام "منتظم" دنیا کے سردار ہوتے تھے۔ جو دنیاوی امور
کا انتظام کرتے تھے۔ اور ایک افسر جو خطرناک خطوط اور بغاوت
کے پیغامات پہنچاتا تھا۔

حکومت برطانیہ کی مخالفت گزشتہ ابواب سے واضح ہو چکا ہے
کہ سید صاحبؒ کی تحریک ایک مستقل جہاد و اصلاح کی تحریک تھی۔ ناگزیر حالات
کی بنا پر اس کا رُخ ابتداء میں سکھوں کی طرف تھا۔ لیکن اس کے پورے پروگرام
کا علم صرف جماعت کے مخصوص لوگوں کو تھا جو اسلامی غیرت و فراست ایک
صوبہ میں غیر اسلامی اقتدار گوارا نہ کر سکتی تھی، وہ اس کو پورے ملک میں کس
طرح گوارا کر سکتی تھی۔ لیکن ہر صاحب بصیرت کہے گا کہ وا قعات و اقدامات
کی یہی طبعی اور مناسب ترتیب تھی جو ظہور میں آئی۔

کیپٹن کننگھم تاریخ سکھ میں لکھتا ہے۔

سید احمد صاحب کے عمل سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کافروں
سے اُن کی مراد صرف سکھ تھے۔ لیکن ان کے صحیح مقاصد
پورے طور پر نہیں سمجھے گئے، وہ انگریزوں پر حملہ کرنے میں
ضرور محتاط تھے۔ لیکن ایک وسیع اور آباد ملک پر ایک دور
دراز کی قوم کا اقتدار ان کی مخالفت کے لئے کافی سبب تھا"

انگریزوں نے جب پنجاب فتح کیا تو مجاہدین کا رخ اُن کی طرف پھر گیا
مولانا ولایت علی صاحب اور اُن کی جماعت نے حالات کے تغیر اور خطرہ کا

احساس کیا اور شروع سے اپنے دائرہ عمل کو وسیع رکھا۔

ہنٹر لکھتا ہے:۔

مجاہدین کی ضرب سکھوں کے دیہاتوں پر شدید تھی۔ لیکن وہ انگریز کافروں پر ضرب لگانے کے ہر موقع کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کرتے تھے۔ انھوں نے کابل کی جنگ میں ہمارے دشمنوں کی مدد کے لئے ایک بڑی فوج بھیجی اور ان میں سے ہزار ایک ہمارے مقابلہ میں موت تک جمے رہے۔ صرف غزنی کے سقوط میں ان کے تین سو آدمیوں نے انگریزی سنگینوں سے شہادت کی خوشی حاصل کی"

پنجاب کے الحاق کے بعد جو غصہ پہلے سکھوں پر اترتا تھا اب ان کے جانشینوں (انگریزوں) پر اترنے لگا"

اُن کی تبلیغ تھی کہ غیر اسلامی اقتدار کے ماتحت مسلمانوں کو زندگی گزارنے کی شرعاً اجازت نہیں"

ڈاکٹر ہنٹر کا بیان ہے (جس سے اس کی ساری کتاب رنگی ہوئی ہے) کہ جماعت کے مبلغین اور پٹنہ کے پیشوا حکومت ہند کے خلاف علانیہ تبلیغ بہار کرتے تھے۔

حکومت ہند کے انتظامات ۱۸۵۰ء میں سر ہنری لارنس نے یہ کارروائی قلمبند کی کہ مولانا ولایت علی پنجاب میں "غازی دین" اور مجاہد اسلام کے لقب سے مشہور ہیں۔ اُن کو اپنے مکانوں میں پٹنہ میں نظر بند رکھا جائے۔ پٹنہ کے مجسٹریٹ نے ان سے ضمانت کی۔ اور جماعت کے دوسرے بہت سے دولتمند ارکان

سے بھی "نیک چلنی" کے مچلکے لئے۔

لیکن سنہ ۱۸۵۰ء میں ان کو جنوبی بنگال کے ضلع راجشاہی میں بغاوت کی تبلیغ کرتے ہوئے پایا جاتا ہے۔ جہاں ان سے حفظ امن کے لئے ضمانتیں لی گئیں۔ اور دوبارہ تبلیغ کرنے کی وجہ سے ان کا دومرتبہ ضلع سے اخراج ہوا۔

سنہ ۱۸۵۱ء میں سید صاحب کے ہی خلفاء جو اپنے شہر میں نظر بند تھے۔ سرحد پر بغاوت پھیلانے کی تبلیغ کرتے ہوئے پٹنہ میں پائے گئے۔

سنہ ۱۸۵۱ء میں ان کو اپنی تجویز میں بہت کچھ کامیابی ہوئی۔ آدمی اور روپیہ ستھانہ کیمپ کثرت سے بھیجے گئے۔ اور پنجاب کے حکام نے ہماری فوجوں سے ان کی ایک باغیانہ خط و کتابت پکڑی۔ ان کے پیشواؤں نے ہماری چوتھی فوج سے ساز کرنے کی بڑی مشاقی سے کوشش کی۔ جو راولپنڈی میں باغیوں کے کیمپ سے بہت قریب ٹھہری ہوئی تھی۔ اور اس رجمنٹ کا جز تھی جو ہمارے صوبہ پر حملہ کرنے کی وجہ سے ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے بھیجی گئی تھی۔

خطوط سے ثابت ہوتا تھا کہ بنگال سے باغیوں کے کیمپ کو آدمی اور اسلحہ بھیجنے کے لئے ایک باقاعدہ ادارہ قائم ہے۔ اسی زمانہ ۱۹ اراگست سنہ ۱۸۵۲ء میں پٹنہ کے مجسٹریٹ نے رپورٹ کی۔ کہ باغی جماعت اور باغیانہ خیالات ترقی پر ہیں۔ انگریزی صوبہ کے اس دارالسلطنت (پٹنہ) کے خاص باشندے علانیہ بغاوت کی تبلیغ کرتے ہیں، پولیس بھی ان سے ملی ہوئی ہے اور ان کے ایک سردار (مولوی احمد اللہ صاحبؒ) نے اپنے مکان میں سات آٹھ سو آدمیوں کے ایک جلسہ میں

اعلان کیا کہ اگر مجسٹریٹ کی طرف سے مزید خانہ تلاشی ہوئی تو وہ ہتھیاروں سے مقابلہ کریں گے۔

حکومت برطانیہ اب زیادہ دنوں تک اپنے علاقہ میں ایک باغیانہ ادارہ کی طرف سے چشم پوشی نہیں کرسکتی۔ ۱۸۵۲ء کی فصل خزاں میں لارڈ ڈلہوزی نے دو اہم کارروائیاں قلمبند کیں۔ انہوں نے اندرونی ادارہ کی پوری نگرانی اور ان سرحدی قبائل کے خلاف مہم بھیجنے کی ہدایت کی جن کی کافروں کے ساتھ دبی نفرت کو ہندوستانی مجنونوں نے ہوا دیکر مشتعل کردیا تھا۔ اسی سال انہوں نے ہمارے خلیف امب کے رئیس پر حملہ کیا۔ اور ہم کو ایک برطانوی فوج اسکی امداد کے لیے بھیجنی پڑی ۱۸۵۳ء میں ہمارے متعدد دیسی باغیوں سے خط و کتابت کرنے کے جرم میں ماخوذ ہوئے۔

حکومت کا جارحانہ اقدام اور ۱۸۵۷-۱۸۶۰ء کی سرحدی جنگیں

۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان سرحدی خلفشار کی سے ہم کو اپنی علیحدہ علیحدہ سولہ مہمیں بھیجنی پڑیں جن میں تینتیس ہزار باقاعدہ سپاہی تھے۔ اور ۱۸۵۷ء اور ۱۸۶۳ء کے درمیان علیحدہ علیحدہ مہموں کی تعداد بیس کو پہنچ گئی۔ جن میں بے قاعدہ مددگاروں اور پولیس کے علاوہ ساٹھ ہزار باقاعدہ سپاہی تھے۔ اس دوران میں ستھانہ کیمپ سرحد میں دائمی تعصب اور مذہبی اشتعال کے باوجود عاقلانہ طریقہ پر ہماری فوجوں سے براہ راست الجھنے سے مجتنب رہ کر ہوشیاری کے ساتھ ہمارے خلاف قبائل کی امداد کرتا رہا اور ان کو اشتعال دلاتا رہا۔ لیکن ان لوگوں کو اپنے حساب پر ہم سے جنگ کرنے کی جرأت نہ ہوئی ۱۸۵۷ء

میں انہوں نے علانیہ ہم سے جنگ چھیڑ دی۔ اور اپنی دیدہ دلیری سے ہم سے جزیہ کا مطالبہ کیا۔ مطالبہ نامنظور ہونے کے بعد وہ دلیرانہ ہمارے علاقہ پر اُتر آئے۔ اور انہوں نے لفٹننٹ ہارن کے کیمپ پر ایک شبخون مارا۔

۱۸۔ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو ایک برطانوی فوج سات ہزار سپاہیوں کی سر نیول چیمبرلین کی قیادت میں سرحد کو روانہ ہوئی۔ علاقہ میں پہنچکر جنرل کو معلوم ہوا کہ قبائل حریف سے مل گئے ہیں۔ حکومت پنجاب کے نام پریشانی میں تار پر تار آرہے تھے کہ امداد و مزید امداد فوراً بھیجی جائے۔ فیروزپور، سیالکوٹ اور لاہور کے دستے فوراً روانہ کئے گئے۔ دو ہفتہ کے اندر اندر پنجاب کی چھاؤنیاں اس طرح فوجوں سے خالی ہوگئیں کہ میانمیر کا افسر کمانڈنگ بڑی مشکل سے لفٹننٹ گورنر کے لئے چوبیس آدمیوں کا محافظ دستہ بہم پہنچا سکا۔ ۲؍ نومبر کو حکومت پنجاب کو ہراول کا ایک دستہ والسرائے کے کیمپ سے مستعار لینا پڑا اور ایک دوسری ملٹری پولیس سوار اور پیادہ مواصلات (رسل و رسائل) کی حفاظت کے لئے بھیجی گئی۔ ۱۲؍ نومبر کو حالات اور زیادہ نازک ہوگئے۔ اور کمانڈر انچیف آف برٹش فورسز لاہور آئے اور خود انتظام اپنے ہاتھ میں لیا، حکومت پنجاب نے پندرہ سو کا ایڈیشنل بریگیڈ بھیجے جانے کی درخواست کی، جنرل چیمبرلین کے تار نے اور ڈرا دیا۔

۱۸؍ نومبر کو دشمن نے حملہ کیا، انگریزی فوج کو پسپا ہونا پڑا۔ ایک سو چودہ آدمی ہلاک ہوئے، دوسری مرتبہ پھر دشمن نے حملہ کیا جس میں جنرل چیمبرلین خطرناک طور پر زخمی ہوئے اور افسروں کے علاوہ ایک سو اٹھائیس آدمی ہلاک ہوئے

۲۰-نومبر کو چار سو پچیس بیمار اور زخمی بھیجے گئے - کل آٹھ سو سینتالیس انگریزی سپاہی زخمی اور ہلاک ہوئے - آخر کار حکومت پنجاب اپنی فوجوں کو واپس بلا لینے پر راضی ہو گئی"

لیکن یہاں بھی وہی تدبیر کارگر ہوئی، جو مسلمانوں کے مقابلہ میں کم خطا جاتی ہے - انگریز حکام اور مدبروں نے قبائل کو توڑ لیا - اور مجاہدین تنہا رہ گئے - ڈاکٹر ہنٹر نے اس موقع پر یہ فخریہ الفاظ لکھے ہیں -

" جو کام ہمارے ہتھیار نہ کر سکتے تھے وہ ہماری ڈپلومیسی نے کر لیا"

لیکن بہر حال یہ تجربہ بہت تلخ ثابت ہوا - اور بقول ڈاکٹر ہنٹر یہ مقابلہ ہم کو بہت گراں پڑا"

سنہ ۱۸۶۸ء میں پھر چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی ۸ ستمبر کو حکومت ہند نے اس کے مقابلہ کے لئے فوجی قوت بھیجی - ۳۰ - اکتوبر کو کمانڈر انچیف کے زیر ہدایت اور جنرل وائلڈ سی - بی کے زیر قیادت فوجیں روانہ ہوئیں - جولائی میں پنجاب گورنمنٹ نے ارجنٹ تار بھیجا کہ طوفان کھڑا ہو گیا - اور خطرہ سر پر ہے - فوری امداد کی سخت ضرورت ہے - سرحد پر فوجیں دو چند کر دی گئیں لیکن متوقع خطرہ پیش نہ آیا - مگر انگریزی فوجیں مخالف کے قلب تک پہنچ سکیں اور پنجاب گورنمنٹ کو افسوس رہا کہ یہ مہم ختم ہو گئی اور ہندوستان کے مذہبی مجنون نہ نکالے جا سکے اور نہ ہم نہیں مطیع کر کے ان کے گھر دل ہندوستان واپس کر سکے -

مقدمہ سازش ۱۸۶۴ء حکومت کو اپنی متعدد شکستوں، زیرباری اور بدنامی سے سخت جھنجھلاہٹ تھی، اس نے اپنا غصہ ہندوستان کے ان رؤسا و شرفا پر اتارا۔ جن کا کچھ بھی تعلق سرحد کے مرکز یا اس تحریک سے ثابت ہوا اور ان سے انتقام کے جوش میں قانون بالائے طاق رکھ دیا۔ ۱۸۶۴ء میں اس نے آٹھ آدمیوں مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری رئیس تھانیسر، مولانا یحییٰ علی صاحب عظیم آبادی، مولانا عبدالرحیم صاحب عظیم آبادی، محمد شفیع سوداگر و رئیس لاہور۔ ان کے بعض کارندوں قاضی میاں جان اور بعد میں مولانا احمد اللہ صاحب رئیس پٹنہ عظیم آباد پر سازش کا مقدمہ چلایا۔ اور ان کو پھانسی کی سزا دی۔ پھر ایک عجیب و غریب نکتہ سے پھانسی کی سزا منسوخ کر کے حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی۔

کتاب تواریخ عجیب" یا کالا پانی" کے چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں جن سے حکومت کا غصہ اور ان حضرات کی استقامت معلوم ہو گی۔

> پارسن صاحب ہم تینوں آدمیوں کو ساتھ لے کر خوشی خوشی بسواری شکرم دہلی کو روانہ ہوا، شکرم میں سوار کرنے سے پہلے مجھکو بیڑی، ہتھکڑی، طوق پہنا کر اور طوق میں بطور رباگ ڈور ایک اور زنجیر ڈال کر اس کا سرا ایک مسلح سپاہی پولیس کے ہاتھوں میں دے کر میرے پیچھے بٹھا دیا۔ اور پارسن صاحب اور ایک دوسرا انسپکٹر پولیس میرے دہنے بائیں بھرے ہوئے تمنچوں کی جوڑیاں لے کر میرے بدن سے بدن ملا کر بیٹھ گئے۔ ان کے

سوا پارسن صاحب بار بار مجھ کو راہ میں کہتا ہوا آتا تھا۔ کہ اگر تم ذرا بھی حرکت کروگے تو میں اس تمنچے سے تم کو مار دوں گا، علی گڑھ سے چل کر دہلی تک کھانا پینا تو درکنار کسی سخت ضروری حاجت کے واسطے بھی ہم نہ اتارے گئے۔ جب نماز کا وقت آتا تو میں بلا طلب و اجازت تیمم کر کے بیٹھے بیٹھے اشاروں سے نماز پڑھ لیتا تھا۔ اور گاڑی بدستور چلی جاتی تھی اور وہ چپ چاپ میری نماز کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔ آخر بصد مصیبت اس حال سے لوہے میں جکڑے ہوئے ہم دہلی میں داخل ہوئے جہاں لیجاکر زیر بنگلہ ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس دہلی کے ہم کو ایک تہ خانہ میں زندہ در گور بند کر دیا۔ دوسرے دن دہلی سے کرنال اور پھر کرنال سے انبالہ ہم کو لے گئے۔ جب ہم انبالہ میں پہنچے بہت رات جاچکی تھی اسی طرح بے آب و دانہ ہم تینوں آدمیوں کو علیحدہ علیحدہ میں پھانسی گھروں میں بند کر دیا۔ جہاں ہم شروع اپریل تک برابر بند رہے۔

دوسرے دن فجر کے وقت پارسن صاحب سپرنٹنڈنٹ اور ٹینجر ونکفیل صاحب ڈپٹی انسپکٹر پولیس اور کپتان ٹائی صاحب ڈپٹی کمشنر انبالہ مثل یاجوج ماجوج کے میری کوٹھری میں آئے اور مجھ سے کہا کہ تم اس مقدمہ کا سب حال بتلا دو۔ تمہارے واسطے بہت بہتر ہوگا۔ میں نے کہا میں کچھ نہیں جانتا۔ اس

وقت پارسن صاحب نے مجھکو پہلے بہت دھمکایا۔ اور پھر مارنا شروع کیا۔ جب میری مار حد کو پہنچی اور میں گر پڑا تو ٹالی صاحب اور ٹنکفیل صاحب کوٹھری سے باہر کھڑے ہو گئے اور جب اس قدر مار پر بھی میں نے کچھ نہ بتلایا تو سب کے سب اس دن مایوس ہو کر چلے گئے۔ میں نے جب یہ کیفیت ظلم و تعدی کی دیکھی تو مجھ کو یقین ہو گیا کہ اب مجھ کو یہ لوگ زندہ نہ چھوڑیں گے۔ میرے ذمہ کچھ رمضان کے روزے باقی تھے دوسرے دن میں نے انکی قضا رکھنی شروع کردی

دوسرے دن جب میں روزے سے تھا۔ علی الصباح پارسن صاحب پھر آیا۔ اور وہی کارروائی شروع کی۔ مگر تھوڑی زدو کوب کے بعد مجھ کو اپنی بگھی میں بٹھلا کر ٹالی صاحب ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر لے گیا۔ جہاں پر وہ دونوں صاحب یعنی ٹالی صاحب اور میجر ٹنکفیل صاحب بھی موجود تھے۔ اس دن انہوں نے میری بڑی چاپلوسی کی۔ اور کہا کہ ہم تحریری عہد کرتے ہیں کہ اگر تم دوسرے شرکا اور معاونین جہاد کو بتلا دو تو تم کو سرکاری گواہ کر کے رہا کر دینے کے سوا بڑا عہدہ بھی دیویں گے۔ اور بصورت نہ بتلانے کے تم کو پھانسی ہوگی۔ میں نے اس چاپلوسی پر بھی انکار کیا۔ تو پھر پارسن صاحب ان دونوں سے انگریزی میں باتیں کر کے مجھ کو ایک الگ کمرے میں لے گیا۔ جہاں لیجا کر پھر مارنا شروع

گیا۔ میں کہاں تک لکھوں آٹھ بجے فجر سے آٹھ بجے رات تک
مجھ پر اس قدر مار پیٹ ہوئی کہ شاید کسی پر ہوئی ہو۔ لیکن
بفضل الٰہی میں سب سہار گیا۔ مگر اپنے رب سے ہر دم یہ
دعا کرتا جاتا تھا کہ اے رب یہی وقت امتحان کا ہے۔ تو مجھ
کو اس وقت ثابت قدم رکھیو۔ جب وہ ہر طرح مایوس
ہو گئے تو لاچار بعد آٹھ بجے رات کے مجھ کو جیل خانہ واپس
بھیجدیا۔ میں تمام دن روزے سے تھا۔ بنگلہ سے باہر
نکل کر درخت کے پتوں سے روزہ افطار کر لیا۔ اور جیل
میں پہنچکر جو میرے حصہ کا کھانا رکھا تھا اُس کو کھا کر ادر شکر
الٰہی کرکے سو رہا۔ جس دن میں ٹائی صاحب کے بنگلہ پر
اس مار پیٹ کی لذت بنگلہ کے اندر اُٹھا رہا تھا اس وقت
منشی حمید علی صاحب تھانپوری تحصیلدار نرائن گڑھ صرف
اس قصور پر کہ اُس نے میری گرفتاری سے چند برس پہلے
اپنے کسی دنیوی معاملہ میں مجھ کو ایک خط لکھا تھا اور بعض
عملہ کچہری نے جو اُس کے دشمن تھے اس خط کے معنی غلط
بیان کر دئے تھے۔ جس پر وہ غریب معزز عہدہ دار معطل
ہو کر باہر برآمدہ میں غمگین بیٹھا۔ میں اس کا غمگین چہرہ دیکھ
کر اپنی تکلیف بھول گیا۔ اور یہ خیال دل میں آیا کہ مجھ منحوس
نالائق کو فقط ایک خط لکھنے پر بیچارہ۔ بے گناہ بھی پکڑا گیا اگر

اس کے بدلے بھی مجھ کو سزا ہو جائے اور یہ رہا ہو جائے تو بہت بہتر ہے۔ میں اپنی اس حالت زار میں اس کے واسطے بہت دعا کرتا رہا۔ فضل الہٰی سے وہ ناکردہ گناہ آخر بری ہو کر پھر اپنے عہدہ پر بحال ہو گیا۔ اور اب تک اول درجہ کا عہدہ دار ملک پنجاب میں ہے"

"اس تاریخ کے بعد پھر مجھ کو کبھی گواہ شاہد ہونے کی ترغیب نہیں دی گئی"

دسمبر سے اپریل تک یہ سب دار و گیر ہو کر بماہ اپریل مجسٹریٹی ضلع انبالہ میں یہ مقدمہ پیش ہوا۔ اور ہم سب لوگوں کو پھانسی گھروں سے نکال کر کچہری میں لے گئے اس وقت معلوم ہوا۔ کہ میرا حقیقی بھائی محمد سعید میرے اوپر اور محمد رفیع حقیقی بھائی محمد شفیع کا اُس کے اوپر پھانسی کی دھمکی سے گواہ ہو گئے ہیں۔ اور اسی کارروائی سے پچاس ساٹھ آدمی جن میں اکثر مولوی ملاں تھے ہمارے اوپر گواہ بنائے گئے۔ لیکن اکثر گواہ گواہی دیتے وقت بھی ہماری طرف دیکھکر زار زار روتے جاتے تھے۔ مگر بے بس۔ اگر گواہی نہ دیویں تو قطع نظر مار پیٹ کے پھانسی کا سامنا تھا۔ اور یہ سب گواہ تا ادائے شہادت محکمۂ سشن کے مثل قیدیوں کے زیر حراست پولیس رکھے گئے تھے اور پولیس ہی سے ان کو عمدہ خوراک

اور لباس ملتا تھا۔ چنانچہ لاکھوں روپیہ سرکار کا ان بے جا
کارروائیوں پر صرف ہو گیا اور مار پیٹ کی تو یہ حالت تھی کہ
عباس نامی ایک لڑکا جو مدت تک میرے گھر میں رہ کر پرورش
پایا تھا جب مجسٹریٹی میں گواہی دیتے وقت مجھ کو دیکھ کر مارے
محبت کے جھوٹا اور آموختنہ بیان میرے اوپر کرنے سے ہچکچایا
تو اسی روز رات کو اس کو ایسی سزا سخت دی گئی کہ وہ بچہ
اسی صدمہ سے قبل از درپیشی مقدمہ سیشن کے مر گیا۔ مگر
رفع بدنامی کے واسطے پارسن صاحب نے اس کا مرنا کسی
مرض سے مشہور کر دیا۔ جس دن ہم اول روز مجسٹریٹی میں حاضر
کیے گئے تو میرا بھائی بھی بزمرہ گواہان زیر حراست پولیس
تھا۔ اس نے مجھ کو بذریعہ ایک سپاہی پولیس کے یہ خبر بھیجدی
کہ مجھکو پولیس نے مار پیٹ کر تمہارے اوپر گواہ بنا لیا ہے۔
سو اب جس وقت برسر اجلاس میرے اظہار تحریر ہوں گے
تو میں اپنے اس بیان سے جو مار پیٹ کر لکھایا ہے پھر جاؤں گا
اس کے جواب میں میں نے اس کو کہلا بھیجا کہ میری قید اور
رہائی کچھ تمہارے بیان پر موقوف نہیں ہے۔ وہ خدا کے
ہاتھ میں ہے۔ اگر تمہارا اظہار بحلف ہوا ہے تو اب اس سے
پھر جانے پر بجرم دروغ حلفی تم کو سزائے سخت ہو جائے گی
میں تو پہلے سے پھنسا ہوا ہوں تمہارے پھنس جانے سے

والدہ ضعیفہ صدمہ کھا کر ہلاک ہو جائے گی۔ اس واسطے بہتر ہے
کہ جو تمنے پہلے لکھایا ہے وہی اب بھی بیان کرو۔ لیکن باین
ہمہ جب اُس کا اظہار میرے سامنے ہونے لگا تو وہ پہلے
اظہار سے منکر ہو گیا۔ صاحب لوگ برسر اجلاس اس کا انکار
سُن کر اول تو بڑے غصے ہوئے۔ مگر بوجہ اس کی صغر سنی۔ کے
اس کو کچھ سزا نہ دے سکے۔ اس کا نام گواہوں سے کاٹ کر
اس کو نکال دیا۔ کثرت گواہوں کے سبب سے ایک ہفتہ تک
فقط یہی مقدمہ کچہری مجسٹریٹی میں پیش ہوتا رہا۔ صاحب لوگوں
کا تعصب ہم لوگوں سے یہاں تک تھا کہ جب بروقت در پیشی
مقدمہ کے ہم نے یہ درخواست کی کہ ہماری نماز کا وقت آگیا
ہے۔ ہم کو نماز پڑھنے کی اجازت بخشی جائے۔ تو یہ اجازت
بھی ہم کو نہ دی گئی۔ مگر وہ ہمارا کیا کر سکتے تھے۔ ہم نے عین
دوران مقدمہ تیمم کر کے بیٹھے ہوئے اشاروں سے نماز
پڑھ لی۔ ایک ہفتہ کی کارروائی کے بعد ہمارا مقدمہ سپرد
سشن ہوا۔ اس وقت تک ہم پھانسی گھروں میں علیحدہ علیحدہ
تید تھو بعد سپردگی سشن کے ہم سب کو ایک جگہ حوالات میں
بند کر دیا۔ اب بعد ایک مدت کے تنہائی اور چلہ کشی کے جو
ہم سب دوست ایک جگہ جمع ہوئے تو بڑی خوشی ہم لوگوں
کو ہوئی۔ میں تو سعدیؒ کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتا تھا ؎

پائے در زنجیر پیش دوستاں ... بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں

مگر ایک مدت دراز تک کے تخلیہ اور تنہائی سے بھی ہم لوگوں کو بہت روحانی فائدہ ہوا تھا۔ انوار الٰہی آئینہ صافیہ قلب میں خوب محسوس ہوتے تھے۔ نماز روزے میں کمال لذت حاصل ہوتی تھی کہ شاید وہ کیفیت برسوں کے چلہ کشی اور گوشہ نشینی میں بھی حاصل نہ ہوتی اس وقت مولوی یحییٰ علی صاحب کی صحبت ایک مغتنمات سے تھی۔"

"اس صبر و استقلال کے انعام کو خیال کر کے اول سے آخر تک میری زبان پر تو شکر ہی شکر جاری رہا۔ مولوی یحییٰ علی صاحب کی کیفیت اس سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر تھی۔ وہ اکثر اس رباعی کے مضمون کو ادا کیا کرتے تھے ؎

فلست ابالی حین اقتل مسلما ... علی ای شق کان اللہ مصرعی

وذلک فی ذات الالٰہ وان یشاء ... یبارک علی اوصال شلو ممزع

(ترجمہ) نہیں پرواہ کرتا ہوں میں جب کہ مارا جاؤں میں مسلمان کسی کروٹ پر ہو پھر کر جانا میرا طرف خدا کی۔ اور یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اگر چاہے برکت دیوے اوپر ملا دینے ٹکڑوں پراگندہ کے؛

یہ وہ رباعی ہے جب حضرت خبیبؓ ایک صحابی کو کفار مکہ پھانسی دینے لگے تو اس نے نہایت جوانمردی سے یہ رباعی پڑھ کر راہ خدا میں جان دی۔ اور شہید ہوا۔ اور اس کی شہادت کی خبر اور اس کا سلام خود جبرئیل علیہ السلام نے رسول خدا صلی اللہ

علیہ وسلم کو مدینہ میں پہنچایا تھا۔ مولوی یحییٰ علی صاحب بڑے دردِ دلِ عشق سے یہ شعر بھی اکثر سید صاحبؒ کے فراق میں پڑھا کرتے تھے:۔

جب صبا کوئے یار سے گزرے	اتنا پیغام درد کا کہنا
دن بہت انتظار میں گزرے	کونسی رات آپ آئیں گے

"بعد التوائے دراز کے ۲ مئی ۱۸۶۴ء پھر ایک آخری اجلاس سشن ہوا اور جج صاحب موصوف اپنی تجویز فتویٰ سزا اپنے گھر بیٹھ کر جب ایما گورنر صاحب کے لکھ لائے تھے، اس دن اجلاس میں بیٹھنے کے ساتھ ہی پہلے چاروں اسیسروں سے سشن جج صاحب نے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ لوگوں نے اس مقدمہ کو اول سے آخر تک سنا اب جو رائے ہو لکھ کر پیش کرو۔ ہم نے دیکھا کہ یہ چاروں اسیسر اس وقت بھی ہماری شکلوں کو دیکھ دیکھ کر آنسو بھر بھر لاتے تھے اور دل سے ہماری رہائی کے خواہاں تھے۔ مگر جب صاحب جج و کمشنر کی رائے کو ہماری سزا پر مائل پایا تو مارے ڈر کے انہوں نے بھی لکھدیا کہ ہمارے نزدیک بھی جرم مندرجہ فرد قرار داد ان پر ثابت ہے۔ پھر تو صاحب جج و کمشنر نے بعد حصول اس حیلہ قانونی کے اپنی تجویز جو پہلے سے بنز پر لکھی رکھی ہوئی تھی پڑھنی شروع کی۔ جس میں آئیں بائیں شائیں کر کے پلوڈن صاحب کی عمدہ دلیل کا جواب تھا

اور پھر سب سے پہلے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ کہ تم بہت عقلمند
اور ذی علم اور قانون داں اور اپنے شہر کے نمبردار اور رئیس
ہو۔ تم نے اپنی ساری عقلمندی اور قانون دانی کو سرکار کی
مخالفت میں خرچ کیا۔ تمہارے ذریعہ سے آدمی اور روپیہ
سرکار کے دشمنوں کو جاتا تھا۔ تم نے سوائے انکار بحث کے
کچھ حیلتاً بھی خیرخواہی سرکار کا دم نہیں بھرا۔ اور زیادہ تر وفاداری
کے اس کے ثابت کرانے میں کچھ کوشش نہ کی۔ اس واسطے
تم کو پھانسی دی جائے گی اور تمہاری کل جائداد ضبط سرکار
ہوگی۔ اور تمہاری لاش بھی تمہارے وارثوں کو نہ دی جائیگی
بلکہ نہایت ذلت کے ساتھ گورستان جیل میں گاڑ دی جائے
گی۔ اور آخیر میں یہ کلمہ بھی فرمایا کہ میں تم کو پھانسی پر لٹکتا
ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوں گا۔ یہ سارا بیان صاحب موصوف
کا میں نے نہایت سکوت سے سُنا۔ مگر اس آخری فقرہ کے
جواب میں میں نے کہا کہ جان لینا اور دینا خدا کا کام ہے آپ
کے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ رب العزت قادر ہے کہ میرے
مرنے سے پہلے تم کو ہلاک کر دے۔" لیکن اس جواب باصواب
پر وہ بہت خفا ہوا۔ مگر پھانسی کا حکم دینے سے زیادہ اور میرا
کیا کر سکتا تھا۔ جس قدر سزائیں اس کے اختیار میں تھیں سب
دے چکا تھا۔ لیکن اس وقت میرے منہ سے یہ الہامی فقرہ

ایسا نکلا تھا کہ میں تو اس وقت تک زندہ موجود ہوں مگر وہ اس حکم دینے کے تھوڑے عرصہ کے بعد ناگہانی موت سے راہی ملک عدم ہوا۔ مجکو اپنی اس وقت کی کیفیت خوب یاد ہے کہ میں اس حکم پھانسی کو سُن کر ایسا خوش ہوا کہ شاید ہفت اقلیم کی سلطنت ملنے سے بھی اس قدر مسرور نہ ہوتا۔ اس حکم کے سننے سے میری وہ کیفیت ہوئی کہ گویا جنت فردوس اور حوریں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگ گئیں۔ میرے بعد مولوی یحییٰ علی صاحب اور اُن کے بعد محمد شفیع اور اُن کے بعد نمبر وار سب آدمیوں کو حکم سزا کا سنا دیا گیا جن میں میں اور مولوی یحییٰ علی صاحب اور حاجی محمد شفیع تین آدمیوں کے واسطے پھانسی وغیرہ حسب مذکورۂ بالا اور باقی آٹھ مجرموں کو دائم الحبس بعبور دریائے شور معہ ضبطی کل جائداد کے سزا ہوئی، میں نے مولوی یحییٰ علی صاحب کو بھی نہایت بشاش پایا۔ لیکن محمد شفیع کے چہرہ کا رنگ بدل گیا تھا۔ تاہم انہوں نے بھی اپنی طبیعت کو بہت تھاما، اس دن پولیس والے اور تماشہ بین مرد عورت بکثرت حاضر تھے۔ قریب تمام کے احاطہ کچہری ضلع انبالہ کا خلقت سے بھرا ہوا تھا، حکم سنا کر ہمکا جیب ہونا تھا کہ صدہا مسلح اہل پولیس زیر حکم کپتان پارسن صاحب میرے نزدیک آکر کہنے لگا کہ تم کو پھانسی کا حکم ملا ہے تم کو رونا

چاہیۓ. تم کس واسطے اتنا بشاش ہے۔ میں نے چلتے چلتے اس کو
بولا کہ شہادت کی امید پر جو سب سے بڑی نعمت ہے اور
تم اس کو کیا جانو۔ اس مقام پر یہ بات بھی بیان کرنا ضروری
ہے کہ پارسن صاحب بھی ایڈورڈس صاحب سے بڑھکر
متعصب تھا۔ اور اس مقدمہ میں شروع سے اس نے ہم
لوگوں پر بہت ظلم کیا تھا کہ جس کی تفصیل یہ قلم بھی نہیں کرسکتا
مگر خداوند تعالےٰ منتقم حقیقی تو موجود تھا، گو اس کے کام دیر اور
مہونیت سے ہوتے ہیں ہم کو سزا ہوکر تھوڑے دن گزرے
تھے کہ یہ بیخوف بھی دنیا ہی میں پاگل ہوکر راہی ملک عدم ہوا۔
اس دن تماشہ میں لوگ ہماری پھانسی کا حکم سُن کر اکثر زار زار
روتے تھے، کوئی خدا کی مرضی اور کوئی راضی بقضا سے اپنے
رنج کو روکتا تھا۔ کوئی دم بخود ساکت ہوکر ہم کو دیکھ رہا تھا۔
جیل خانہ تک بیسیوں مرد عورت ارد گرد سڑک کے ہمارا منھ
دیکھتے ہوئے چلے گئے۔ اسی حالت کے اندر پولیس ہم کو
جیل خانہ میں لے گئی اور وہاں پہنچ کر ہمارے کپڑے اور
لباس معمولی اتار کر ضبط کر لئے گئے۔ اور ہم سب کو گیروا
لباس پہنادیا۔ ہم تین پھانسی والوں کو علیحدہ علیحدہ تین پھانسی
گھروں میں بند کر دیا۔ باقی آٹھ آدمیوں کو جیل خانہ میں دوسرے
قیدیوں کے ساتھ ملا دیا۔ ۲ مئی کی رات کو جب ہم ان تنگ تاریک

کوٹھریوں میں جو نواب سراج الدولہ کے بلیک ہول قاعہ کلکتہ سے بھی بڑھی ہوئی تھیں بند ہوئے۔ تو پہلی ہی رات کو ایک جہنم کا نمونہ ہو گیا۔ اُسکی صبح کو ہم نے اہالیان جیل خانہ سے اپنی یہ تکلیف بیان کرکے چاہا کہ کسی طرح ہم کو بوقت شب ان کوٹھریوں سے باہر رکھا جائے۔ مگر سب اہالی جیلخانہ مارے ڈر کے انکار کرکے باہر چلے گئے۔ لیکن ان کا انکار کرکے جیلخانہ سے باہر نکلنا تھا کہ سامنے سے ایک سوار تارگھر سے ایک ضروری لفافہ لیکر پہنچا۔ لفافہ کھولکر جو دیا۔ تو اس میں یہی لکھا تھا کہ ان تین پھانسی والوں کو بوقت شب میدان میں باہر سلایا کرو۔ یہ طرفہ تماشا تائید الٰہی کا دیکھ کر اسی دم جیلخانہ والوں نے ہم کو یہ حکم سنا دیا۔ ہمارے واسطے بڑے اہتمام سے تین نئی پھانسیاں) اور اس کے رسّیاں رسّے تیار ہوئے اور ادھر مثل مقدمہ کو واسطے منظوری پھانسی کے محکمہ چیفکورٹ پنجاب میں بھیج دیا"

۲ رمئی تاریخ سنانے حکم پھانسی سے ۱۶ ستمبر تک ہم پھانسی گھروں میں بند رہے۔ اہالیان جیل ہمارے پھانسی دینے کا سامان تیار کر رہے تھے۔ اور ادھر ہم انگریزوں کا تماشا بن رہے تھے صدہا صاحب لوگ اور میم روزانہ ہمارے دیکھنے کو پھانسی گھروں میں آتے تھے۔ مگر بخلاف دوسرے عام پھانسی پانے والوں کے ہم کو نہایت شاداں و فرحاں پاکر یہ یورپین زوّارین

بہت تعجب کرتے اکثر ہم کو پوچھتے تھے کہ تم کو بہت جلد پھانسی ہو گی۔ تم خوشی کس واسطے کرتے ہو۔ ہم اس کے جواب میں صرف اس قدر کہہ دیتے کہ ہمارے مذہب میں خدا کی راہ میں ایسے ظلم سے مارے جانے پر درجہ شہادت کا ملتا ہے۔ اس واسطے ہمکو خوشی ہے"

اب اس مقلب القلوب کی ظاہری کارروائی سنئے۔ جب بہت سے صاحب و میم ہم کو پھانسی گھروں میں نہایت شاداں اور فرحاں دیکھ گئے تو یہ چرچا سب لوگوں میں پھیلا تب اون صاحب لوگوں نے جو ہمارے جانی دشمن تھے ؛ خیال کیا کہ ایسے دشمنوں کو منھ مانگی موت شہادت جس کے واسطے وہ ایسا خوش ہو رہے ہیں دینی نہیں چاہیئے۔ بلکہ ان کو کالے پانی بھیجکر وہاں کی مصائب اور سختیوں سے ہلاک کرانا چاہیئے ہم نے دیکھا کہ مطابق ہماری اسی پیشین گوئی کے صاحب ڈپٹی کمشنر انبالہ ۱۶ ستمبر کو پھانسی گھروں میں تشریف لائے۔ اور چیف کورٹ کا حکم ہم کو پڑھکر سنا دیا کہ تم لوگ پھانسی پڑنے کو بہت دوست رکھتے ہو اور شہادت سمجھتے ہو اس واسطے سرکار تمہاری دل چاہتی سزا تم کو نہیں دیوے گی۔ تمہاری پھانسی سزائے دائم الحبس بعبور دریائے شور سے بدل گئی۔ بعد سنانے اس حکم کے پھانسی گھروں سے دوسرے

قیدیوں کے ساتھ بارکوں میں ملادیا۔ اور جیل خانے کے دستور
کے موافق مقراض سے ہماری داڑھی مونچھ اور سر کے بال
وغیرہ سب تراش کر منڈی بھیڑ سا بنادیا۔ اس وقت میں نے
دیکھا کہ مولوی یحییٰ علی صاحب اپنی داڑھی کے کترے ہوئے
بالوں کو اٹھا اٹھا کر کہتے تھے کہ افسوس نہ کر تو خدا کی راہ میں
پکڑی گئی۔ اور اس کے واسطے کتری گئی"۔

۱۸۶۵ء میں یہ لوگ پورٹ بلیر انڈمان بھیجے گئے ان لوگوں کے
جانے کے بعد صادق پور پٹنہ کے وہ مکانات جن میں جماعت کے لوگ ٹھہرتے
تھے مع مکانات مسکونہ کھدوا کر پھنکوادئے گئے ۱۸۷۲ء کے اخیر تک بہار اور
بنگال میں گرفتاری کا سلسلہ جاری رہا۔ پٹنہ میں امیر خاں سوداگر چرم اور مولوی
تبارک علی وغیرہ، بپنہ میں مولوی امیرالدین اور اسلام پور میں ایک معمر وضعیف
شخص ابراہیم منڈل کو گرفتار کیا گیا۔ اور پرلنے گواہوں سے گواہی دلواکر کالے
پانی روانہ کر دیا گیا۔ امیر خاں کی جائداد سے حکومت نے مقدمہ کا کل خرچ
پورا کیا۔ پورٹ بلیر میں مولانا احمد اللہ صاحبؒ اور مولانا یحییٰ علی صاحبؒ نے
انتقال فرمایا۔ ۱۸۸۳ء میں اٹھارہ برس کے بعد مولوی محمد جعفر صاحب اور ان کے
رفقا کی رہائی کے احکام جاری ہوئے۔ اور یہ حضرات ہندوستان واپس آئے
مولانا عبدالرحیم صاحب نے صادق پور کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ وہ
انہیں کے الفاظ میں سننے کے قابل ہے۔

صادق پور گیا تو وہاں دیکھا کہ ہم لوگوں کے مکانات کل منہدم

کر کے کف دست میدان بنادیا گیا ہے۔ اور اس پر بازار میونسپلٹی کے مکانات بنادئے گئے ہیں، میں نے چاہا کہ اپنے خاندانی مقبرہ کو جہاں چودہ پشت سے ہمارے آبا و اجداد دفن ہوتے چلے آئے تھے جاکر دیکھوں اور خصوصاً اپنے والدین ماجدین غفر اللہ لہما کے مزار کی زیارت کروں اور اس پر دعائے مغفرت اور فاتحہ پڑھوں مگر ہر چند کہ کوشش کی پتہ نہ ملا، بعد تجسس وتفحص بسیار غور وفکر کے قرینہ سے معلوم ہوا کہ حضرت والدین ماجدین کی قبریں کھود کر اس پر بنائے عمارت میونسپلٹی بنادی گئی ہے، اے حضرات ناظرین اس وقت اس حرکت کا جو ہماری اموات کے ساتھ کی گئی جو صدمہ دل پر گذرا بیرون از حیطہ تحریر وتقریر ہے۔ اس وقت تک اس کی یاد سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے جرم میں ہماری اموات و آبا و اجداد کی قبریں کیوں کھودی گئیں اور وہ مقبرہ کیوں معرض ضبطی میں آیا۔ ہماری عادل گورنمنٹ نے کیوں یہ کام کیا۔"

جماعت کی سیرت واخلاق سید صاحبؒ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ آپ کی سب سے بڑی کرامت اور آپ کی زندہ یادگار آپ بیدا اور تربیت کی ہوئی وہ بے نظیر جماعت تھی جس کی مثال اتنی بڑی تعداد میں اور اس جامعیت وکاملیت کے ساتھ خیر القرون کے بعد بہت کم ملتی ہے۔ ان کی صحیح اور محتاط

تعریف یہ ہے کہ وہ تیرھویں صدی میں صحابہ کرام کا نمونہ تھے۔ اور یہ کسی مسلمان فرد یا جماعت کے لیئے آخری تعریف ہے، یہ لوگ بلا مبالغہ عقائد، اعمال و اخلاق توحید، اتباع سنت، شریعت کی پابندی، عبادت و تقویٰ، سادگی و تواضع، ایثار و خدمت خلق، غیرت دینی، شوق جہاد و شہادت، صبر و استقامت میں مہاجرین و انصار کا نمونہ تھے، مولانا حالی مرحوم نے مسدس میں صحابہ کرام رضؓ کی نہایت اچھی اور بولتی ہوئی قلمی تصویر کھینچی ہے۔ ان بزرگوں کا سراپا بھی اس سے زیادہ مکمل نہیں کھینچا جا سکتا۔ اور یہ لباس صحابہؓ کے بعد ان کے بدن پر راست آتا ہے:

سب اللہ کے حکم بردار بندے — سب اسلامیوں کے مددگار بندے
خدا اور نبیؐ کے وفادار بندے — یتیموں کے بیواؤں کے غمخوار بندے
رہ کفر و باطل سے بیزار بندے
نشہ میں مئے حق کے سرشار بندے

جہالت کی رسمیں مٹا دینے والے — کہانت کی بنیاد ڈھا دینے والے
سر احکام دیں پر جھکا دینے والے — خدا کے لئے گھر لٹا دینے والے
ہر آفت میں سینہ سپر کرنے والے
فقط ایک اللہ سے ڈرنے والے

اگر اختلاف ان میں باہم دگر تھا — تو بالکل مدار اس کا اخلاص پر تھا
جھگڑتے تھے لیکن نہ جھگڑوں میں شر تھا — خلاف آشتی سے خوش آیند تر تھا
یہ تھی موج پہلی اس آزادگی کی

ہرا جس سے ہونے کو تھا باغ گیتی

نہ کھانوں میں تھی واں تکلف کی کلفت — نہ پوشش سے مقصود تھی زیب و زینت

امیر اور لشکر کی تھی ایک صورت — فقیر اور غنی سب کی تھی ایک حالت

لگایا تھا مالی نے ایک باغ ایسا

نہ تھا جس میں چھوٹا بڑا کوئی پودا

خلیفہ تھے امت کے ایسے نگہباں — ہو گلے کا جیسے نگہبان چوپاں

مسلمان و ذمی کے سب حق تھے یکساں — نہ تھا عبد و حر میں تفاوت نمایاں

کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسی

زمانہ میں ماں جائی بہنیں ہوں جیسی

رہِ حق میں تھی دوڑ اور بھاگ ان کی — فقط حق پہ تھی جس سے تھی لاگ ان کی

بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ ان کی — شریعت کے قبضہ میں تھی باگ ان کی

جہاں کر دیا نرم نرما گئے وہ

جہاں کر دیا گرم گرما گئے وہ

کفایت جہاں چاہیے واں کفایت — سخاوت جہاں چاہیے واں سخاوت

جچی اور تلی دشمنی اور محبت — نہ بے وجہ الفت نہ بے وجہ نفرت

جھکا حق سے جو جھک گئے اس سے وہ بھی

رکا حق سے جو رک گئے اس سے وہ بھی

مولانا یحییٰ علی صاحب مولانا یحییٰ علی صاحب پٹنہ میں ہندوستان کی جماعت مجاہدین کے امیر تھے۔ اور سید صاحب کے رنگ میں سرتا پا غرق۔ اور

آپ کی محبت میں سرشار تھے، مولانا عبدالرحیم صاحبؒ صادقپوری نے "درمنثور" میں آپ کے جیل کے جو حالات لکھے ہیں ان سے آپ کی عظمت اور اس جماعت کی سیرت واخلاق کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

ہمارے حضرت مولانا کا صبر واستقلال اس وقت کا قابل دید تھا شب کو آپ اور میں ایک ہی جگہ رہتے آپ پچھلی شب حسب معمول نماز ودعا وغیرہ میں مشغول رہتے اور اکثر اشعار عاشقانہ دیوان شاہ نیاز، حافظ وغیرہ کے پڑھتے اور ایک نہایت وجدی کیفیت آپ پر طاری ہوتی۔ ہم لوگ سب ہوش باختہ ہوتے اور آپ نہایت مسرور وخوش۔ آپ کے چہرہ بشرہ سے کچھ بھی آثار رنج ومحن کے پائے نہیں جاتے۔ ذکر اللہ سے رطب اللسان رہتے۔ آپ اکثر اس شعر کو بھی جو حضرت خبیب صحابی رضی اللہ عنہ کا ہے مترنم ہوتے۔

فلست ابالی حین اقتل مسلما　　علی ای شق کان فی اللہ مصرعی
وذلك فی ذات الالٰہ وان یشأ　　یبارك علی اوصال شلو ممزع

میرے پاس ایسے الفاظ نہیں ہیں کہ جن سے آپ کی اس کیفیت وجدی وصبر وشکر کا ایک شمہ بھی بیان کرسکوں اور اس کی تصویر کھینچکر ہدیہ ناظرین کرتا تو یہ ایک امر محال ہے"۔

"چونکہ موسم نہایت گرم تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ آدمی ایک ہفتہ سے زیادہ اس کوٹھری میں رہے اور پھر جانبر ہو۔ لہٰذا ڈاکٹر نے حکم

دیا کہ کوٹھری کا دروازہ کھلا رہے اور ایک پہرا سپاہی کا خاص
اُس دروازہ پر مقرر رہو کہ یہ لوگ کوٹھری سے قدم باہر نہ لا سکیں
چنانچہ ہمارے حضرت اس قید تنہائی میں پھر تخمیناً دو ڈھائی
مہینے رہے۔ اور نہایت صبر و استقلال کے ساتھ ان ایام کو
آپ نے بسر کیا اور جب کوئی سپاہی پہرے والا یا اور کوئی
سپاہی قیدی آپ کے سامنے آجاتا ہندو یا مسلمان سب کو
آپ توحید باری کا وعظ سناتے۔ عذاب آخرت و قبر وغیرہ سے
ڈراتے۔ الغرض ایک عجب طرح کا فیض آپ کا اس قید تنہائی
میں بھی جاری رہا۔ سپاہی جو پہرے کے واسطے آتا وہ سکھ ہوتا
یا گورکھا اور مسلمان نہ ہوتا۔ آپ اس آیت کریمہ کا وعظ سناتے
ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ سپاہی
کھڑا روتا۔ اور جب اُس کے پہرے کی بدلی ہوتی تو اس صحبت
کو چھوڑ کر جانا پسند نہیں کرتا۔ میں کچھ لکھ نہیں سکتا کہ کس قدر فائدہ
اس وقت پہرے والوں کو پہنچا اور کتنے موحد ہو گئے۔ اور کتنے
دین آبائی کو چھوڑ کر مسلمان ہو گئے۔ لا یعلمہ الا اللہ۔ آپ
کا فیض کبھی کسی حالت میں بند نہ ہوا۔ آپ کا جسم مبارک قیدی
تھا۔ مگر آپ کے دل و زبان آزاد تھے۔ اس پر کسی کی حکومت
نہ تھی بجز اس حاکم حقیقی کے، اگر گورنمنٹ کے واسطے بھی کوئی
آدمی سامنے آجاتا آپ امر معروف و نہی عن المنکر بجا لاتے،

بعد اس کے حکم پھانسی منسوخ ہوا۔ اور حکم دوام حبس بعبور دریائے شور معہ ضبطی جائداد ان تینوں پھانسی والوں کے واسطے بھی صادر ہوا۔ اور یہ لوگ قیدیوں میں ملائے گئے۔ اور حسب دستور اُس جیل کے جیسے ہم لوگوں کی ڈاڑھی منڈوا دی گئی تھی ویسا ہی آپ کی ڈاڑھی منڈا دی گئی۔ اور ایک کرتا کمر تک کا گیروا رنگا ہوا اور ایک ٹوپی کان ڈھپی گیروا رنگی پہنا دی گئی یہ جوگیانہ لباس اس جیل میں قانوناً ہر ایک کو دیا جاتا تھا، اس کی صبح کو کپتان ٹائی صاحب مجسٹریٹ و ڈپٹی کمشنر انبالہ و پارسن صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس جیل میں آئے۔ اور داروغہ کو حکم دیا کہ مولانا سے سخت تر مشقت لی جائے۔ چنانچہ خود اس نے اپنے روبرو کھڑے ہو کر ایک بڑے کنویں پر جو رہٹ چل رہا تھا عین تمازت آفتاب میں اس رہٹ کو آٹھ دس قیدی چلا رہے تھے اور وہ بمشکل چلتا تھا آپ کو بھی اس میں دے دیا آپ دو تین روز تک تمام دن اُس کو چلاتے رہے۔ آپ کو بباعث حرارت آفتاب خون کا پیشاب آنے لگا، آپ نہایت صبر و شکر کے ساتھ اس کو انجام دیتے رہے، دوسرے قیدی جو نہایت قوی اور توانا اس رہٹ کو کھینچتے کھینچتے بیٹھ جاتے تھے مگر آپ صبح سے شام تک اس میں لگے ہی رہتے چونکہ اس وقت ڈاکٹر صاحب موجود نہ تھے مجسٹریٹ صاحب نے

یہ کارروائی اپنے دل کا غصہ نکالنے کو کرلی، جب ڈاکٹر صاحب دو تین روز کے بعد جیل میں تشریف لائے اور نوآمد قیدیوں کا ملاحظہ کیا، جناب مولانا کو رہٹ کے کام میں دیکھ کر داروغہ پر نہایت خفا ہوئے کہ اس کو یہاں کیوں لگایا ہے، داروغہ نے عرض کیا کہ مجسٹریٹ صاحب خود تشریف لاکر لگا گئے ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب کو مجسٹریٹ سے چشمک تھی، فی الفور آپ کو وہاں سے چھڑا کر برعکس اس کے ایک نہایت آسان کام میں لگا دیا۔ یعنی دری بافی کے کارخانہ میں چھت کے نیچے دری کا سوت کھولنے کا کام آپ کو دیا گیا۔ آپ حمد و ثنا ر باری میں شب و روز مصروف رہتے اور کام مفوضہ سرکاری کو بھی باحسن وجوہ انجام کرتے مثل اور قیدیوں کے تساہل و تکاہل کو کام میں نہ لاتے۔ اور دوسرے قیدیوں کو بھی نصیحت فرماتے کہ جب تم سرکاری کھانا کھاتے ہو اور کپڑا پہنتے ہو اور مکان میں رہتے ہو تب ضرور ہے کہ سرکاری کام کو انجام دو اور قیدی لوگ جو جیل کے اندر حکم عدولی اور بدمعاشی وغیرہ کرتے ان سے ان کو روکتے اور نصیحت کرتے، صدہا قیدی اس جیل میں ایسے نیک چلن ہو گئے کہ جس کو دیکھ کر داروغہ وغیرہ اہلکاران جیل حیران رہ جاتے ۔"

"ہمارے حضرت نہایت باطمینان قلب نہایت خندان و شادان دفرحاں یاد الٰہی میں اور لوگوں کو استقامت دلانے میں شب و روز مصروف رہتے۔ دنیائے دوں کی بے ثباتی اور اُس کے راحت و آرام کی بیقراری اور ثواب آخرت اور جنت نعیم کی پائداری یاد دلاتے۔ اور رضوان من اللّٰہ اکبر کو خوب کھول کر فرماتے۔ اس وقت کی کیفیت آپ کی قابل دید تھی۔ قلم کو جو ایک کاہ خشک ہے کہاں وہ طاقت کہ طوا اس کو بیان کر سکے۔ فقیر مؤلف بھی اس زلزلہ میں گرفتار تھا آپ کے قدموں کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے بچا لیا۔ کہ اغوائے شیطانی سے محفوظ رکھ کر بیہودہ گوئی و بیہودات بکنے سے رکا رہا اور مہالک ہلاک میں گرنے فللہ الحمد علی ذلک اگر آپکا ساتھ نہ ہوتا تو ایسے مہالک سے بچنا متعسر بلکہ محال تھا صبر و استقلال مجھ جیسے نالائق کو کہاں میسر یہ تو بہت بڑے لوگوں کا کام ہے صرف اس قدر کہ زبان ناپاک باتوں سے بچی رہی۔ ہزار ہزار شکر اس قادر مطلق کا ہے اس وقت ایک اور امتحان اس نالائق پر خاص کر کے آیا کہ کمشنر صاحب وڈپٹی کمشنر صاحب کی خواہش ہوئی کہ بذریعہ کمترین مولوی عبداللہ ساکن افغانستان سے پیغام مصالحت کیا جائے کہ جنہوں نے بمقام ...ہ وغیرہ سرکار سے جنگ ہوئی تھی اور وہ اس کمترین کے

چچازاد بھائی تھے اسی حالت میں قیدیوں کی چالان انبالہ سے
لاہور جانے کو تیار کی گئی۔ اس میں جناب حضرت مولانا و منشی
محمد جعفر صاحب وغیرہ کل تیار کر دیئے گئے مگر محمد شفیع و عبدالکریم
و الٰہی بخش جو بوجہ گواہی ہم لوگوں سے علیحدہ کر لئے گئے تھے
رکھ لئے گئے۔ اور یہ فقیر بھی بوجہ کارروائی صلح روک لیا گیا
اور نیز میں تنفس سخت میں اس وقت مبتلا تھا۔ کہ لیاقت سفر
مطلق نہ تھی۔ اس وجہ سے بھی ڈاکٹر نے مجھے روک لیا اور
جناب حضرت مع چھ آدمیوں کے روانہ جیل لاہور کئے گئے
اب اس وقت سے عرصہ دو سال تک میں صحبت کیمیا خاصیت
سے اپنی بداعمالیوں کے سبب مہجور کر دیا گیا۔ اب جو کچھ میں
بیان کروں گا ان دو سالوں کی کیفیت وہ سنی ہوئی ہوگی۔
الغرض آپ انبالہ سے روانہ ہو کر مع دوسرے منتشر قیدیوں
کی جیل لاہور میں پہنچے اور وہاں قریب ایک برس کے آپ کا
قیام رہا۔ اور اس اثناء میں برابر قیدیوں کو آپ پند و
نصائح کیا کرتے۔ چونکہ قیدخانہ میں مجمع بدکاروں اور چور ڈاکو
وغیرہ کا رہا کرتا ہے آپ کا وعظ بھی انہیں افعال ذمیمہ کے
بیان میں ہوتا اور توحید و تاکید صوم و صلوٰۃ کی ہوتی، صدہا
چور اور ڈاکوؤں نے توبہ کی کہ اب کبھی اس پیشہ کو نہ کریں گے
آپ ان کو عذاب دائم مقیم سے ڈراتے، صدہا موحد اور نمازی

ہو گئے۔ ایک بلوچ ڈاکو کا ماجرا بیان کیا جاتا ہے اس کا نام
مرزی تھا۔ اس کے آباو اجداد سے چوری و ڈکیتی کا پیشہ چلا
آتا تھا۔ وہ نہایت قوی ہیکل جوان تھا اس نے جیلخانہ میں آکر
بہت کچھ شرارت کی تھی۔ سرکاری کام ہرگز نہیں کرتا۔ صدہا بید
اس کو لگائے گئے مگر اس نے اُف نہیں کیا۔ اپنی بدچلنی سے
باز نہیں آیا۔ بیڑی اندڈ ونڈا بیڑی ہتھکڑی اور طوق و قید
تنہائی وغیرہ جو کچھ سزا وہاں ہے وہ سب اس پر عمل میں لایا گیا
لیکن وہ باز نہ آیا۔ داروغہ و جمعدار سب اس سے ڈرتے
وہ ان کو بھی موقع پاکر ہتھکڑی سے پیٹ دیتا، خدا کے حکم
سے آپ کا بستر اور اس کا ایک ہی جگہ ہو گیا۔ خدا کی قدرت
کہ آپ کی نصیحت و پند سے تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی
کیفیت بدل گئی۔ اس نے سرکاری مشقت کرنی شروع
کر دی اور ایسا نیک چلن بنگیا کہ داروغہ وغیرہ سب متحیر ہوگئے
ہتھکڑی اور طوق وغیرہ سب اُس سے دور کر دئے گئے اور
پارچہ بافی کے کارخانہ میں وہ داخل کر دیا گیا۔ کہ جہاں دائم
الحبس اور بڑے بڑے میعادی قیدی کام کیا کرتے تھے اور
عمدہ کام کرنے اور زیادہ کام کرنے پر سال میں دو ایک ماہ
قید معاف بھی ملا کرتی ہے۔ اس نے وہاں جاکر بہت جلد
پارچہ بافی کا کام سیکھ لیا اور نہایت عمدہ کپڑا بننے لگا، میں

جب لاہور کے جیل میں گیا خود میں نے اس مرزی بلوچ کو دیکھا کہ وہ پانچوں وقت نماز قید کے ساتھ پڑھتا اور اپنے گذشتہ اعمال کو یاد کر کے خوف خدا سے اکثر روتا، اے بھائیو میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے جب اس کو دیکھا ایک ولی پایا۔ اس قسم کے اور بہت سے ماجرے ہیں میں نے یہ ایک تمثیلا بیان کیا۔ الغرض آپ کا وجود با جود اس قید خانہ میں واسطے ہدایت قیدیوں کے بھیجدیا گیا تھا۔ کہ ہزاروں فیضیاب ہو گئے اہل کاران جیل اس کرامات کو آپ کے دیکھ دیکھ کر نہایت متحیر و متعجب ہوتے۔ تمام ہندو آپ کو دیوتا اور اوتار کہتے اور مسلمان ولی سمجھتے، اتوار کا روز جو فرصت کا قیدیوں کے ہوتا، فجر کو بعد ملاحظہ ڈاکٹر آپ کے پاس مجمع ہو جاتا آپ حسب حال اُن قیدیوں کے بدکاریوں سے بچنے کا اور نیک چلنی اور توحید الٰہی کا بیان فرماتے اور صوم و صلوٰۃ کی تاکید فرماتے، بعد اس کے آپ معہ دوسرے قیدیوں کے لاہور سے بسواری ریل روانہ ملتان ہوئے وہاں ہفتہ عشرہ قیام کر کے بسواری مرکب دخانی روڑی بھکر سکھر جو ملک سندھ میں واقع ہے، ہوتے ہوئے کوٹلی پہنچے اور وہاں سے بذریعہ ریل کراچی بندر اور وہاں ہفتہ عشرہ قیام کر کے بسواری مرکب دخانی براہ سمندر بمبئی پہنچے اور وہاں سے بسواری

ریل بمقام تھانہ (جو ایک شہر کا نام ہے) اور وہاں بہت بڑا قلعہ جو مرہٹوں کا بنایا ہوا ہے اور اب وہ جیل کا کام دیتا ہے اُس میں بھیجدئے گئے - وہ نہایت سخت جیل ہے کہ دوسرے جیلی اس سے زیادہ پناہ مانگتے ہیں اور وہاں کے اہلکار اور جیلر وغیرہ قوت قلبی میں دوسرے جیلوں کے نسبت بدرجہا زیادہ تمام احاطہ بمبئی و پنجاب کے شریر ترین قیدی اُس جیل میں بھیجدئے جاتے ہیں - آپ ہر جگہ اپنا کام کرتے رہے چند مہینوں تک آپکا وہاں قیام رہا - آپ کا فیض بدستور وہاں بھی جاری رہا - بعد اس کے آپ آٹھویں دسمبر ۱۸۶۵ء بسواری جہاز بادبانی مع دیگر قیدیوں کے روانہ پورٹ بلیر انڈمان ہوئے - اور صعوبات و تکلیفات جہاز کو طے کر کے بتاریخ گیارھویں جنوری ۱۸۶۶ء آپ داخل جزیرہ انڈمان ہوئے - بعد اس کے جناب منشی محمد کبر زمان صاحب نے جن کے اوصاف حمیدہ اور شریف پر اوپر بیان ہو چکی ہے آپ کو اپنے مکان میں لیجاکر رکھا اور باجازت چیف کمشنر صاحب اپنی تائید میں لے لیا - چونکہ جناب منشی صاحب کو کام بہت کیا کرتے تھے - لہذا جناب مولانا کو حاضری کچہری سے بچا کر اپنی مد میں داخل کیا - اب دونوں حضرات یعنی جناب مولانا احمد اللہ و مولانا یحیی علی رحمہ اللہ علیہما ایک ہی جگہ جمع ہو گئے اور میاں

بہت سے بڑے تھے اکثر فرصت کے وقت میں آپ اپنے مکان میں [illegible] ۴۴۴

عبدالغفار صاحب کو بھی منشی صاحب ممدوح نے کام نمبر سازی سکھا کر ان کو بھی اپنے ہی مکان میں جگہ دی۔ بالجملہ یہ تینوں شخص ایک ہی مکان میں رہنے لگے۔ جناب مولانا کا کام یہ تھا کہ بعد فرصت از کار سرکار لوگوں کو قرآن و حدیث پڑھاتے نصیحت کرتے۔ گھر گھر پھر نے عورتوں کو نماز کی تعلیم کرتے قرآن پڑھاتے۔ صدہا مرد عورت کہ جنہوں نے اپنے معبود حقیقی کے سامنے سر نہ جھکایا تھا پکے نمازی بن گئے۔ اسی اثنار میں یہ کمترین بھی بعد مہاجرت دو برس کے پورٹ بلیر میں پہنچگیا اور تقریباً تین چار مہینے آپ کی حضوری خدمت سے پھر مشرف ہوا۔ دو برس بعد آپ وہاں اپنی عمر عزیز کو یاد خدا و تعلیم و تلقین خلق اللہ میں صرف کر کے بتاریخ بیسویں فروری ۱۸۶۸ء لبیک کہتے ہوئے داخل خلد بریں ہوئے۔

باقی خلفاء | مذکورہ بالا چند حضرات کے علاوہ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب، حضرت شاہ یعقوب صاحب، مولانا مخصوص اللہ صاحب خلف مولانا شاہ رفیع الدین صاحب بھی حضرت سید صاحب کے خلفا تھے اور ان کے علاوہ سو سے زیادہ خلفاء کرام کے اسمار گرامی در منثور فی تراجم اہل صادقپور۔ سوانح احمدی اور سیرت سید احمد شہید وغیرہ میں شمار کرائے گئے ہیں جو ہندوستان کے مختلف صوبوں کے باشندے تھے اور اپنے اپنے مقام پر تحریک کے حامل اور مبلغ رہے — بیرون ہند بھی آپ کے چند خلفا کام کر رہے تھے

خلفاؑ کی خدمات اور خدمات کے نتائج کا بیان کرنا طوالت طلب ہے۔ ہم ایک خاص لطیفہ پر اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

لطیفہ: تاریخ شاہد ہے کہ جہاد حریت ۱۸۵۷ء کی شدت اور قوت شمالی ہند میں یعنی بنگال۔ بہار۔ یوپی۔ پنجاب اور سرحد میں بہت زیادہ تھی۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں حضرت سید صاحب کے خلفاء بکثرت تھے اور حضرت سید صاحب کی تحریک کا زیادہ اثر تھا۔ مدراس وغیرہ میں حضرت سید صاحب کے خلفا کی تعداد بہت کم تھی تو اسی نسبت سے جہاد حریت کا اثر بھی کم تھا۔ اس لطیفہ سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حضرت سید صاحب کی تحریک سے جہاد حریت ۱۸۵۷ء کا تعلق کس قدر گہرا تھا۔

تحریک کی ہمہ گیری: یہ تحریک ابتداء میں اگرچہ ان تمام مصائب سے دوچار ہوئی جس کا ذکر پہلے گذرا۔ مگر اس کا ہمہ گیر اثر یہ تھا کہ مولانا فضل الحق صاحب خیر آبادی بھی اسکے حامی ہو گئے۔ آپ نے فتویٰ دیا کہ ہندوستان دار الحرب ہے اور نصاریٰ سے جہاد واجب ہے، اور پھر صداقت و پختگی یہ کہ جس شخص نے اس فتویٰ کی خبر حکومت کو پہنچائی تھی پیشی کے وقت جب شناخت کے لئے حاضر اجلاس ہوا تو مولانا فضل حق کے تقدس اور آپکی بزرگی سے مرعوب ہو کر کہدیا کہ یہ وہ مولانا فضل حق نہیں مگر مولانا فضل حق صاحب کی راستبازی نے گوارا نہ کیا کہ سچے مسئلہ کا اس خطرناک وقت میں اخفا کریں آپ نے خود فرمایا: "یہ شخص اب جھوٹ بولتا ہے پہلے سچ کہا تھا۔ وہ فضل حق میں ہی ہوں جس نے ہندوستان کو دار الحرب اور نصاریٰ سے جہاد کو واجب قرار دیا ہے"۔

بہر حال حضرت مولانا کو عبور دریا شور کی سزا ہوئی۔ اور آپ نے دنیا کو دکھا دیا کہ مولانا اسمٰعیل صاحب شہید سے کسی جزوی مسئلہ میں اختلاف اور چیز ہے اور صداقت دریا سداری شرع مقدس اور چیز۔ فرحمہم اللہ۔ اللھم اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا۔ وصلی اللہ علی خیر خلقہ وآلہ واصحابہ اجمعین (محمد میاں عفی عنہ)